زیر نظر
ساغر نظامی

قدیم وجدید اراکین
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
نواب وقار الملک مرحوم
"پیمانہ"
"جوبلی نمبر"

قیمت سالانہ علاوہ محصول عہ

صفحۂ تعارف

قیمت ششماہی علاوہ محصول ۔

جلد ۴ — پیمانہ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء — نمبر ۶

تصاویر (۱) گروپ:- (۱) سر سید احمد خاں (ب) سید محمود (ج) وقار الملک (د) محسن الملک (ہ) علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا (۲) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۳) ڈاکٹر ضیاء الدین (۴) نواب سر سالار جنگ بہادر (۵) عروس علم (۶) اسکندریہ کے مینار اور قدیم مصری رسم الخط (۷) مولانا شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی

جرعات

میں دسمبر کے جرعات حیدرآباد دکن میں لکھ رہا ہوں، چشم تصور کی ایک شعاع اگرہ میں ہے اور ایک حیدرآباد کی متنوع و منتشر فضاؤں میں۔ اس نمبر کی تکمیل بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے مستقر پر ہونی چاہئے تھی۔ اسوقت جو کچھ آپکی نگاہ کے سامنے ہے اس میں پریشان خیالی کا حصہ زیادہ ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ میری ساعی کہانتک کامیاب ہوئی ہیں۔ اور میں اس نمبر کو کس حدتک آپ کے ذوقِ ادبی سے متوازن کر سکا ہوں۔

میں ارباب و احبابِ حیدرآباد کا شاکر ہوں جنکی توجہ فرمائی میری کامیابی کا باعث ہوئی خصوصاً یمین السلطنۃ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقابہٗ نے اپنے ایثار و اخلاقِ شاہانہ کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا' مولانا جوش ملیح آبادی' مولوی مسعود علی بی۔ اے اور مولوی عبدالرزاق بسمل میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے اس نمبر کی تدوین میں میرے لئے اکثر سامان مہیا کئے اور توسیع اشاعت میں مدد فرمائی۔

پیمانہ کی علمی و ادبی شخصیت جس قدر ارفع و افضل ہے اس سے ہندوستان کی ادیب اور شاعر بہت کافی واقف ہیں اسلئے ان آراد کے نمایش دوراز کار ہے جو پیمانہ کے متعلق بکثرت وصول ہوتی رہتی ہیں جو لوگ اس قسم کی لغویات کے حامل ہیں' میں انہیں بتانا چاہتا ہوں!

ہم کسی سے کیوں کریں اظہارِ جلوہ گستری جس میں جلوے ہیں وہ خود جلوہ نما ہوجائیگا

دسمبر کا پیمانہ قطعی وقت پر شایع ہورہا ہے اس نمبر سے تاخیر فنا ہوگئی' یقین ہے کہ پیمانہ آئندہ کبھی تاخیر پذیر نہوگا' (انشاء اللہ تعالیٰ) ختم سال کے بعد پیمانہ کی چوتھی جلد بھی ختم ہوجاتی ہے۔ جنوری ۱۹۲۶ء سے نئی جلد کا آغاز ہے' نئی جلد گویا پانچویں جلد ہوگی۔ اس جلد سے پیمانہ میں کیا کیا اضافے ہونگے؟ اسکا اندازہ "تاریخ پیمانہ" کے صفحات الٹ کر کیجئے۔ پہلی جلد سے دوسری میں' دوسری جلد سے تیسری میں' اور تیسری جلد سے چوتھی جلد میں کسقدر دلچسپ اور مفید اضافے اور کیسے کیسے عجیب تنوعات صرف ہوئے ہیں۔

جنوری ۱۹۲۶ء سے "العارف" (مولانا سید احمد مارہروی مدظلہٗ) کی ایک تاریخی کتاب کا سلسلہ شروع ہوگا،

جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بیحد مفید، اہم اور کار آمد ہے، اور موضوع کے لحاظ سے نہایت ہمہ گیر۔ یعنی دنیا میں جسقدر اسلامی عمارتیں ہیں ان سب کا یکجائی تذکرہ، جامعیت اور وضاحت کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے، مولانا سید احمد کی یہ تحقیق و تلاش ستائش سے مستغنی ہے۔ "تاریخ صحافت" اس موضوع کے ضمن میں آجتک ایسی جامع کتاب پیش نہیں کرسکتی ۔

"تذکرۃ الناثرین" ایک جدید اور دلچسپ تذکرہ ہے جس میں ابتدائے نثر نگاری سے اسوقت تک کے نمونے مع سنین و حواشی دئے گئے ہیں۔ مولانا انتظام اللہ صدیقی نے اس تذکرہ کو نہایت محنت سے مرتب کیا۔ یہ وہ موضوع ہے جسکی تکمیل کیلئے ہندوستان کے چند ہستیاں اب بھی پریشان ہیں، جنوری سے انشاء اللہ تعالیٰ اسکی قسطیں بھی شروع ہوجائینگی ۔

"تاریخ پر ایک اجمالی تبصرہ" مولانا سید محمد ہاشمی دہلوی (رکن دارالترجمۂ عثمانیہ یونیورسٹی) کا ایک مختصر ترین مضمون اس نمبر میں شائع ہورہا ہے، حقیقتاً یہ مضمون نہایت عجلت میں لکھا گیا ہے مولانا آجکل ایک عظیم الشان لغت کی تدوین میں بے حد مصروف ہیں۔ لیکن مجھے مستقبل میں یقین ہے کہ صفحات پیمانہ پر ہاشمی دماغ کی اعلیٰ ترین تخلیقات توجہ سے ثبت ہونگی ۔

عالم اسلام کیلئے دسمبر کا یہ آخری قومی ہفتہ جسقدر جاذب توجہ ہے اسیقدر جامع مسرات بھی ہے۔ یہ اجتماع عظیم مدتوں یادگار رہیگا۔ اور علمی و ادبی مجالس کے نتیجہ خیز اثرات قوم کے مستقبل کو درخشاں کردینگے، میری وطنیت کا احساس میرے تبسم میں وجد کررہا ہے، اور اپنے مولد کی اہمیت و عظمت مجھے ایک روحانی افتخار اور معنوی وقار سے ہم آغوش کئے دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم و عمل کی حیثیت سے جو مرتبت آج سرزمین علیگڈھ کو حاصل ہے وہ عہد سلاطین اسلام کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ معمور فضاؤں کی بلند آہنگی اور منور ہواؤں کی تازگی "سرسید کی لوح تربت" پر رحمت و عزت کے پھول برسا رہی ہے اور فرشتۂ اقبال کہہ رہا ہے

اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ　　　شہر جو اجڑا ہوا تھا اسکی آبادی تو دیکھ

اے اذاں کی صداؤں اور تکبیر کی نواؤں میں محو خواب پیکر مقدس! اٹھ اور دیکھ کہ تیرے خواب دوش کی تعبیر کسقدر خوشگوار اور خوش آئند ہے ۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے　　　خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اختتام سال کی ہر فنا ہو جانے والی شام "سحر نوروز" کو ہم سے قریب تر کر رہی ہے اور ہم صبح جدید کی مستانہ اداؤں کے تصور سے اپنے قلوب کو مشرقِ اُمید محسوس کر رہے ہیں۔ مبارک ہیں وہ علم دوست نفوس جو اس عالم نو کی تازہ اور معصوم فضاؤں کے لئے "پیمانہ" طلب ہیں کہ لذتِ حیات کی حقیقی شیرینی سے مسرور کرنیوالا یہی ایک واحد جام تسکین ہے۔

بے حجابانہ بیا جانب میخانۂ ما — مے چکد کوثر فردوس ز پیمانۂ ما

میں اپنے واجب التعظیم مکرم سید امین الحسن رضوی اور مولوی سید محمد حسن بلگرامی کی اُن ہمدردانہ نوازشوں کا معترف ہوں جو ازراہِ کرم و اخلاق دورانِ قیامِ حیدرآباد میں انہوں نے میرے ساتھ مرعی رکھیں۔ میرے دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے ترقی و عروج کی دعائیں نکل رہی ہیں۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ خدا کی رحمتیں اُنکے وجود میں میری دستگیر ہوئیں۔ مجھے اُمید ہے کہ انکی نوازشیں ہمیشہ اسیطرح میرے شامل رہینگی اور میں ہمیشہ انکی ادب نوازی کے نغمے اپنے قلم سے گاتا رہونگا۔

منشی فضل اللہ مصوّر

حیدرآباد میں فنِ نقاشی کے ایک تنہا مظہر ہیں۔ قدرت نے اُن کے مُوقلم میں ایک امتیازی قوت و جدّت عطا فرمائی ہے۔ اگر وہ کوشش کریں تو ہندوستان کے بہترین آرٹسٹ بن سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ انکی خدمات سرزمین دکن تک محصور ہیں۔ اور دوسرے صناعیں کیطرح ملک نے کشادہ دلی کیساتھ ابھی انکی پذیرائی نہیں کی ہے۔ اگر ممکن ہو تو "فضل اسکول" کے بعض اختراعات فائقہ پیمانہ پیش کریگا۔ اور "فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ" کی یہ عملی تصویر مبصرین کی نگاہوں کو کسی خاص آرٹسٹ کے کمالات تک محدود نہ رہنے دیگی۔

ایڈیٹر

22/12/25

1925

1973
1925
48

ادبِ قوم کا یہ نقشِ مصوّر

سپہرِ دکن کے آفتاب و ماہتاب

یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد

جی سی آئی ای ۔ کے سی آئی ای

اور

نواب سر سالار جنگ بہادر

کی علم طراز کرنوں سے

معنون

کیا جاتا ہے

خوشا ضیائے مہ و مہر دل نواز من است
کہ جلوہ ہا بہ جہانِ ادب طراز من است

ساغر نظامی سیمابی

ارشادات

یمین السلطنت ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد بہادر

جی سی آئی ای - کے سی آئی ای

اس چشمِ سرمگیں سے میں سُرمہ در گلو ہوں
دل میں ہزار آرزو ہیں جاسوسِ گفتگو ہوں

اس گلشنِ جہاں میں میرا ہے درسِ عبرت
خاموش مثلِ غنچہ ہنگامِ گفتگو ہوں

اک مدعائے نایاب آوارہ کر رہا ہے
جس کی طلب میں ہر دم سرگرمِ جستجو ہوں

غفلت ہے کس بلا کی اتنی خبر نہیں ہے
کھویا ہے کس کو میں نے کیوں محوِ جستجو ہوں

دل میں نہیں سماتی ہے جوش پر مئے عشق
اس میکدے میں ساقی لبریز اک سبو ہوں

ہو بختِ نارسا سے حرماں نصیب ایسا
پاتا نہیں ہوں اسکو گو محوِ جستجو ہوں

دونوں جہاں ہیں مجھ میں نیرنگیاں ہیں مجھ میں
عالم کا ہوں تماشا عالم کی آرزو ہوں

نغمے بھرے ہیں مجھ میں اسرارِ قدرتی کے
تارِ نفس سے ہر دم اک سازِ گفتگو ہوں

کیا حالِ دل سناؤں دل خستہ ہوں کہ ایسا
دودِ نفس سے اپنے میں سُرمہ در گلو ہوں

ہرگز نہیں ہوا میں منت کشِ بہاراں
وہ گل ہوں اس چمن میں اپنا ہی رنگ و بو ہوں

ہے کون دوست میرا دشمن ہے کون میرا
ہوں دوست شادؔ اپنا اپنا ہی میں عدو ہوں

دسمبر ۱۹۲۵ء

ادبیات

خلاصۂ الباب

ہندوستان کا عظیم الشان دار العلوم
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

علیگڈھ علیگڈھ جو آج مدینۃ العلم کہلانے کا صحیح حقدار ہے بہت قدیم تاریخی مقام ہے جس نے راجپوت مرہٹہ اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمتیں دیکھی ہیں۔ اور جسکے ذرہ ذرہ میں صنادید ہند کے آثار جھلک رہے ہیں۔

یہ شہر ہندوستان کے مغرب بعید میں ۱۹۴۶ میل مربع رقبہ میں آباد ہے اسکے شمال میں ضلع بلند شہر، مشرق وجنوب میں ایٹہ، اور مغرب وجنوب میں واقع ہے، شمالی اور مغربی گوشہ کو پنجاب کے ضلع گوڑگاؤں سے رود جمنا اور شمالی مشرقی گوشہ کو ضلع بدایون سے رود گنگا ــــ ممیز کرتی ہے علیگڈھ کی تاریخ قدیم بارہویں صدی عیسوی تک قطعاً تاریک ہے، یہ پہلے "کول" یا "کوئل" کہلاتا تھا "کوشارب" یا کول چند بنسی قوم کا ایک زبردست حاکم تھا جس نے اپنے نام پر اسکا نام کول رکھا لیکن بالارام نے "کول" کو قتل کر دیا اور "دوآب" کے ہمسایہ حصوں پر قبضہ کر کے قدیم شہر کی حیثیت کو قطعی بدل ڈالا،

ایک روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کے حملۂ اول سے پہلے اس ضلع پر "ڈور" راجپوت حکمراں تھے جن کا سلسلہ بارہویں صدی کے آخر میں "مہاراجہ باران" تک باقی رہا ۱۱۹۴ء میں قطب الدین دہلی سے کول کی جانب روانہ ہوا اور کول کو فتح کر لیا، اسوقت سے مسلمان صوبہ دار معمور ہوتے رہے لیکن پھر بھی ہندوستانی راجاؤں کی گذشتہ عظمت بہت کچھ باقی رہی چودہویں صدی عیسوی میں تیمور کے حملے سے کول کو سخت نقصان پہونچا جسکی وجہ سے پندرہویں صدی عیسوی تک وہ متواتر بلاؤں اور بدنصیبوں کی آماجگاہ بنا رہا۔

جب سلاطین مغلیہ نے دہلی پر تسلط کر لیا تو ۱۵۲۶ء میں بابر نے کوچک علی کو "کول" کا گورنر مقرر کیا متعدد مساجد اور اسلامی عمارات اس زمانے میں تیار کی گئیں جو عہد مغلیہ کے اس فردوسی عہد کی یادگار تھیں لیکن شہنشاہ اورنگزیب کی وفات کے بعد ہی مختلف جنگجو خانہ بدوش جماعتوں نے نواح "دوآب" میں فساد برپا کر دئے۔

مرہٹے سب سے پہلے میدان میں آئے اور اُنکے بعد جاٹ۔ ۱۷۵۷ء میں جاٹوں کے سرگروہ سورج مل نے کول پر قبضہ کر لیا جسکی مرکزی حیثیت متھرا، آگرہ، دہلی اور روہیلکنڈ کے لئے فوجی اعتبار سے زیادہ اہم ہو گئی، اسکے بعد ۱۷۵۹ء میں افغانوں نے جاٹوں کو درہم برہم کر دیا اور آیندہ بیس برس تک یہ ضلع دو جنگجو قوموں کی جولانگاہ

بنا رہا۔ لیکن ان ہنگاموں اور آویزشوں کا کوئی خاص اثر مترتب نہ ہوا یہاں تک کہ ۱۷۸۴ء میں سندھیا نے اپنے قدم جمانے
یہ ضلع ۱۸۰۳ء تک مرہٹوں کے قبضہ میں رہا اِس عرصہ میں صرف چند ماہ کے لئے روہیلہ فوج بسرکردگی غلام قادر خاں
قلعۂ علیگڈھ میں مقیم رہی مرہٹہ سرداروں کے عہد میں علیگڈھ کو ایک نہایت اہم قلعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی' یہاں
ڈی باوئن (　　　　) مرہٹہ فوجوں کو مغربی طریق و نظام کے مطابق مرتب کرتا رہا۔ جب ۱۸۰۲ء میں
سندھیا' راجہ ناگپور' اور ہلکر کے اتحاد ثلاثہ نے برٹش نظام دکن' اور پیشوا کے خلاف اپنی قوتوں کا مظاہرہ کیا' اُسوقت
علیگڈھ کی فوجیں' سندھیا کے فرانسیسی جنرل پیرن (　　　　) کے زیر نظام تھیں' انگریزی فوجیں ۵ اپریل
تک علیگڈھ کی عرحد میں پڑہ گئیں' پیرن نے میدان جنگ کا انتظام اپنے ذمہ لیا مگر اس کے طرفدار مرہٹوں نے نہایت
کمزوری سے اسکی مدد کی جو معمولی دیسی لباس میں اپنی کامیابی یا ناکامیابی کا انتظار کر رہے تھے۔
اگست ۱۸۰۳ء میں ایک انگریزی فوج لارڈ لیک کی سرکردگی میں علیگڈہ پر حملہ آور ہوئی' اور پیرن سے میدان
میں مقابلہ ہوا' مگر غنیم انگریزوں کے آتش فشاں حملوں کی تاب نہ لا سکا' پیرن دفعتاً بھاگ نکلا اور کچھہ عرصہ کے
بعد اُس نے اپنی شخصیت کو لارڈ لیک کے سپرد کردیا'
قلعۂ علیگڈہ اب ایک دوسرے یوروپین افسر کی سرکردگی میں مرہٹہ فوجوں کے قبضے میں تھا۔ ۴ ستمبر کو
انگریزی فوجیں اور آگے بڑہیں تو انہیں ایک فرانسیسی ماہر فن جنگ کی قلعہ بندیوں اور مرہٹوں کی خندقوں اور
مستقل فوج آرائیوں کا مقابلہ کرنا پڑا مگر بالآخر ایک زبردست اور ناقابل مقاومت حملے نے مرہٹوں کے پاؤں
اکھاڑ دئے۔ اور علیگڈہ کے قلعہ پر انگریزی فوجوں کا قبضہ ہوگیا۔
حصص مفتوحہ کی فوراً ترتیب کی گئی' تھوڑے عرصہ کے بعد جبکہ علیگڈہ کے پرگنے فتح گڈھ اور اٹاوہ میں
تقسیم ہوچکے تھے موجودہ ضلع کا خاص حصہ ۱۸۰۴ء میں مختص کرلیا گیا۔
ابھی انتظامات نامکمل تھے کہ ہلکر اپنی پوری قوتوں کے ساتھ آمادۂ جنگ ہوگیا' اُسکے سفراء نے ان ضلعداروں
کو جو گذشتہ مرہٹہ سلطنت میں دولتمند ہوچکے تھے بھڑکایا کہ وہ حکومت جدید کے خلاف بغاوت کریں۔
۱۸۰۵ء میں یہ ہنگامہ فرو کردیا گیا' مگر دوسرے ہی سال بغاوت پھر شروع ہوگئی اور اِس کے سرغنہ باغی کمونہ کے
قلعہ پر سخت مقابلہ کرنے کے بعد جلا وطن کردئے گئے۔ ۱۸۱۶ء میں ضلعداروں سے پھر لڑائی ہوئی اور اب لازمی ہوگیا کہ
ان کے مامن برباد کردئے جائیں' اِس انتظام کے بعد ایام غدر تک ضلع کے سکون میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہیں ہوئی۔
بغاوت میرٹھ کی خبریں کول میں ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو پہونچیں اور جو دیسی فوجیں علیگڈھ میں موجود تھیں وہ اُس سے
فوراً اثر پذیر ہوگئیں بغاوت شروع ہوگئی معمولی غارتگریاں اور آتشزدگیاں ہوکر رہ گئیں ۲ جولائی ۱۸۵۷ء تک
مڈراک کے والنٹیروں کی ایک مختصر جماعت بغاوت کا مقابلہ کرتی رہی' لیکن پھر وہ بھی عاجز آگئی۔ اور اب ضلع

باغیوں کے قبضہ میں تھا۔ ایک ہندوستانی امن سبھا کول کو غارت گری سے بچانے کے لئے قائم ہوئی، لیکن باغیوں نے اُسے بھی درہم و برہم کردیا، اور ایک شخص جس کا نام نسیم اللہ تھا ۱۱ ، گیارہ دن تک شہر میں اپنی شخصی حکومت کا اعلان کرتا رہا۔ اس کی کوششوں نے ہندو آبادی کو ملا لیا اور برٹش فوجوں کے مقابلہ میں جنگ آزمائی کے لئے مزید اسباب آمادگی پیدا کردئے قدیم جاٹ اور راجپوت جماعتیں بھی اس موقع پر ہر طرف آمادۂ فساد تھیں، دفعتاً ۲۴، اگست ۱۸۵۷ء کو ایک مختصر برٹش فوج نے کول کی طرف حرکت کی اور باغیوں کو آسانی کے ساتھ شکست دیدی اور شہر سے باہر نکال دیا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اس کے بعد بھی ظہور پذیر ہوتے رہے، مگر گورنمنٹ کے قبضہ میں کوئی جنبش نہ آسکی۔

۱۸۵۸ء کے اختتام تک بغاوتیں قطعاً دوآب سے نکال کر پھینک دی گئیں۔

کول اکثر مسلمان گورنروں کا صدر مقام رہا ہے اور آئین اکبری میں اسے صوبۂ آگرہ میں ایک سرکار کا صدر مقام بنایا گیا ہے، وہ قلعہ جس میں اکثر لڑائیاں ہوئی ہیں شہر سے ۳ میل پرہے جو پانی کے قطعات اور دلدل سے گھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اکثر برسات میں اسکی قوتیں فطری طور پر زیادہ ہوجاتی ہیں اور قلعہ بہت زیادہ دشوار گذار ہوجاتا ہے۔ سولہویں صدی میں اس کا نام محمد گڈھ تھا۔ جبکہ کول کا حکمران "محمد" لودہیون کی قیادت میں یہاں برسر حکومت تھا ۱۷۱۷ء میں ایک دوسرے گورنر ثابت خاں کے بعد ثابت گڈھ کہلایا ۱۷۵۷ء میں جاٹوں نے اس کا نام رام گڈھ رکھا اور جب نجف خاں نے اس پر قبضہ کیا تو اس کا نام علیگڈھ ہوگیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں ایک بہت بڑی مسجد بنائی گئی ۱۸۹۸و۹۹ء میں ضلع کے روساء نے (۹۰۰۰) نوے ہزار روپیہ لگا کر مسجد کی مرمت کی سلطان نصیر الدین محمود کی فتحمندی کی یادگار میں ۱۲۵۲ء میں یہاں ایک مینار بنایا گیا تھا جو ۱۸۶۲ء میں مسمار کردیا گیا۔ علیگڈھ کے اندر اور باہر بہت سے مسلمان فقراء کی قبریں ہیں ۱۸۸۹ء میں لائل لائبریری کا افتتاح ہوا اور بہت خوبصورت عمارت بنائی گئی ۱۸۵۸ء میں گھنٹہ گھر (مینار الساعات) تعمیر ہوا۔

حسن انقلاب سے وہ گڈھ یا قلعہ جو صرف ایک صدی پہلے تک جنگ و جدل اور اور مدافعانہ اسباب "تحفظ" کے لئے مشہور تھا، ایک خوشگوار تغیر عظیم کا حامل ہوا، اور آج ایک

عظیم "جامعہ اسلامیہ" کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ارض وسیع و بسیط میں شہرت و عظمت کی زندہ یادگار ہے۔
لوگ کہتے ہیں کہ بانئ علیگڈھ کالج نے "علیگڈھ" کے انتخاب میں غلطی کی اور محض پنجاب کی قوتوں کو توڑنے کے لئے یہاں ایک وسیع درسگاہ کی بنیاد قائم کی۔ لیکن یہ ایک متعصب قیاس ہے جو بانئ اوّل کے خیالات سے منطبق نہیں ہوتا۔ سرسید علیہ الرحمۃ کی صلح کل اور ہمہ گیر ہمدرد طبیعت کسی صوبہ یا اہل صوبہ کے خلاف کبھی کارفرما تھی۔ اُن کا مقصد عام طور پر علم و عمل کی روشنی پھیلانا تھا۔ اور علیگڈھ کا انتخاب محض اس بنیاد پر مبنی تھا کہ یہاں کی سادہ اور کثافت اثرات سے غیر کثیف فضائیں علم کی پرورش کا کے لئے دوسرے مقامات سے زیادہ موزون و مناسب تھیں۔
علیگڈھ آب و ہوا کے لحاظ سے ایک ممتاز جگہ ہے، خصوصاً اس کا شمالی میدان، جہاں علیگڈھ کالج کے بانی نے پہلا سنگ بنیاد قائم کیا تھا، صحت جسم، اور نشو و نمائے دماغ کے لئے بہترین "دار الصحت" ہے۔ کسی سرزمین کی صلاحیت و موزونیت عموماً شاداب بلند درختوں اور شفاف چشموں سے پہچانی جاتی ہے جس میدان میں علیگڈھ کالج یا مسلم یونیورسٹی کی جبروت آفرین عمارتیں اپنی بانی کی نفاست تجویز پر وجد کر رہی ہیں وہ میدان بیحد سرسبز اور بلند درختوں سے گھرا ہوا ہے، جتنے کنوئیں اس وقت موجود ہیں سب شیرین اور صاف پانی سے لبریز ہیں۔ یہ وجہ بھی تھی کہ بانی دار العلوم نے "دہلی" "آگرہ اور لکھنؤ کی دار السلطنتوں کو نظرانداز کرکے علیگڈھ کی آزاد اور دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی فضاؤں کو منتخب کیا۔

سرسید احمد خاں رح سرسید علیہ الرحمۃ کے واقعات حیات سے قریب قریب ہر شخص واقف ہے اور مرحوم کی ذات اقدس و اعلیٰ اب مزید تعارف کی محتاج نہیں ہے، تاہم مجھے کچھ مختصراً آرزوئے نگارش ہے،
سرسید مرحوم ایک غیر معمولی دماغ لے کر آئے تھے انھیں اگر اختلافِ عقائد کے لحاظ سے ولی نہ مانا جائے تو بھی وہ مصلح اعظم ضرور تھے، مسلمانوں کی اصلاح کا سہرا سب سے پہلے انھیں کے سر رہا ۱۸۵۷ء کے بعد جب کہ بغاوت عامہ کے متعلق تفتیش و کاوش ہو رہی تھی، سرسید رح بھی ایک جماعتِ محققین کے رکن خصوصی تھے گروہ اور لوگوں کیطرح بے گناہوں، اور گناہگاروں کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ جو لوگ فی الحقیقت بے قصور تھے وہ اُن کے یقینی حامی تھے، اور اس خصوص میں مسلمانوں کے لئے تو وہ ایک رحمت بن گئے تھے ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے فی مابین جو نفرت اور خوف کی بنیادیں قائم ہو گئی ہیں وہ کسی طرح منہدم ہو جائیں۔
۱۸۵۸ء میں سرسید نے ایک رسالہ "اسبابِ غدر" شائع کیا جس میں بغاوت کا ذمہ دار عامۃ الناس کی بعض اہم تکالیف کو قرار دیا، ۱۸۶۰ء میں "وفادار مسلمانانِ ہند" کے نام سے پھر ایک رسالہ شائع کیا جس میں مسلمانوں کے سر سے الزام بغاوت بالکل ہٹا دیا اور ثابت کر دیا کہ مسلمان ہمہ وقت امن پسند اور وفادار رہے ہیں۔
اس جد و جہد کے بعد جب انھیں ذرا اطمینان ہوا، تو بعد غور اُن پر منکشف ہوا کہ مسلمانوں کی عام جہالت

ان بے چینیوں کی ذمہ دار ہے، وہ اس احساس کی گہرائیوں میں کھو گئے اور آخر اُن کے غور و فکر نے انھیں اس نتیجہ تک پہونچا دیا کہ مسلمان اگر ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کے استبداد و تحقیر سے آزاد رہ سکتے ہیں۔ تو اسکا ذریعہ صرف تحصیل علوم ہے۔ ۱۸۵۹ء میں جب وہ مراد آباد میں تھے اُن کے خیال کی عملی بنیاد ایک مدرسے کی صورت میں قائم ہوئی پھر جب ۱۸۶۲ء میں انکا تبادلہ غازیپور ہو گیا تو وہاں ۱۸۶۴ء میں ایک مدرسہ کا افتتاح کیا اُدھر تو ان کی کوشش اور ہمت مدرسوں کے انعقاد و افتتاح کی محرک تھی اُدھر وہ اکثر کتابیں اور تراجم شائع کر کے مسلمانوں اور غیر قوموں کے قلوب کو علمی لذّات کی طرف جذب کر رہے تھے۔

بالآخر ۱۸۶۴ء میں انکا تبادلہ علیگڈھ ہوا، اور یہ انکا آخری مستقر تھا جہاں انھیں ہمیشہ کے لئے ٹھہرنا اور زندۂ جاوید ہونا تھا۔

یہاں ۱۸۶۶ء میں سر سید علیہ الرحمہ نے "برٹش انڈیا ایسوسی ایشن" قائم کیا، "ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل کمیٹی" کی بنیاد ڈالی، اور اپنی ادارت میں "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجرا کیا، جو آجتک اُن کی شخصی یادگار ہے ۱۸۶۷ء میں حکومت ہند سے ایک اردو یونیورسٹی کے لئے تحریک کی گئی، مگر بوجوہ اس میں کامیابی نہ ہو سکی، وہ ہر وقت اس خیال میں غرق رہتے تھے، کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد باہمی پر اصلاحِ ملک کی بنیاد قائم کی جائے مگر انھیں اسوقت بھی یقین ہو گیا تھا، کہ اتحاد بین الاقوام ایک کمزور خیال ہے تاہم وہ اسی دھن میں لگے رہے اور سوچتے رہے کہ اہل ملک کی ترقی اور حکومت کی تسلی کے کیا کیا طرائق ممکن العمل ہیں۔

ان دنوں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح زندہ تھے، سر سید نے ایک استفتار کے ذریعہ معلوم کیا کہ انگریزوی مدرسوں میں مسلمان مغربی علوم کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، شاہ صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا، اور سر سید مشاہدات و تجارب کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔

وہاں سے واپس ہو کر مرحوم نے "رسالہ تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس کا ذکر ادبی حلقوں میں آجتک عزت و اعتراف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سر سید رح کے فلسفیانہ اور منطقی مضامین نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالدی۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، علامۂ شبلی وغیرہ سنجیدہ افراد مضبوط دماغ سر سید کے ساتھ کام کر رہے تھے، آخر انہوں نے بسم اللہ لکھکر علیگڈھ میں ایک کالج کے افتتاح کا ارادہ کر لیا ۱۸۷۲ء میں اس ادارہ کی ایک تصویر لفظوں میں کھینچی گئی اور علمائے اسلام کے سامنے بغرض منظوری پیش کی گئی اس تجویز کا ملک کے سامنے پیش ہونا تھا کہ دبی ہوئی آگ ایکدم بھڑک اٹھی اور ہر طرف سے اس کے خلاف احتجاج بلند ہو گیا، مگر اس اختلاف و احتجاج سے سر سید رح کے ارادوں میں ذرا سی بھی لغزش نہ پیدا ہو سکی ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول کھولدیا گیا، اور ۱۸۷۷ء میں علیگڈھ کالج کا سنگ بنیاد لارڈ لٹن کے ہاتھوں سے نصیب ہو گیا ابھی کالج کے قیام کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا

کہ سرسید نے حکومتِ ہند سے یونیورسٹی کا مطالبہ شروع کیا مگر حکومت نے جو مرحوم کی دماغی رفتار کو تعجب اور بہ نگاہ اندیشہ دیکھ رہی تھی، یونیورسٹی دینے سے انکار کر دیا، باوجود انکار سرسیدؒ نے آٹھ لاکھ روپیہ صرف کر کے ایک عظیم الشان عمارت یونیورسٹی کے قابل تیار کر دی، انھین معلوم تھا کہ انکی تجویز ایک دن ضرور کامیاب ہوگی وہ اپنے ارادون مین ایک زندگی اور کامیاب روشنی دیکھ رہے تھے۔ سنہ ۱۸۸۳ء میں سرسیدؒ نے سول سروس ایسوسی ایشن کی بنیاد قائم کی تاکہ حکومت کے شعبون میں انجام کار کی صلاحیت مسلمانون میں پیدا ہو سکے، سنہ ۱۸۸۶ء میں "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کا انعقاد کیا گیا۔ تاکہ اس کے ذریعہ تمام ہندوستان میں مدارس کا قیام آسان ہو جائے

انیسوین صدی عیسوی کی تمام تحریکات اور اصلاحات کو دیکھتے ہوئے سرسیدؒ کی اولوالعزمانہ ہمہ گیری اور مسلکی رہنمائی کے اقرار میں سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے، وہ مسلمانون کے لئے شاہراہ تعلیم کو جن ناقابل گذار گھاٹیون سے نکال کر لائے وہ انھین کا حصہ تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہب اور مذہبی مذاق کی پرورش اور نشو و نما اُن کا خصوصی لائحۂ عمل تھی وہ اسلامی تعلیم کو تمام علوم متداولہ پر ترجیح دیتے تھے، اور یہ انکی ایک ایسی ادا تھی جس پر آج تک عالمِ اسلام جھوم رہا ہے۔

آخر سنہ ۱۸۹۸ء میں جبکہ ابتدائی مراحل بالکل طے ہو چکے تھے، اور شاہراہ عمل میں کوئی کانٹا خلش آفرین نہ تھا یہ سرچشمۂ اولیاتِ علم و عمل، اپنی بنا کردہ درسگاہ کی خلوتِ محفوظ میں سکون طلب ہوا اور اسکی مبارک روح اب تک اپنے **کارنامۂ عزم و استقلال** کی بدستور نگرانی کر رہی ہے،

کے
مسلم یونیورسٹی اب علیگڈھ کالج "یونیورسٹی" کی صورت میں جلوہ گر ہو چکا ہے اور جو اعلیٰ ترین صورِ ترقی سرسیدؒ ذہن میں محفوظ تھین، وہ قریب قریب سب عملی صورت میں رونما ہو چکی ہیں۔

آج ۲۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء کی صبح

یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ جوبلی کی سحر نور وز ہے (جو ۲۴ مئی سنہ ۱۹۲۵ء کو پورے ہو گئے) اس کے اراکین نے تمام ہندوستان کو مدعو کیا ہے کہ وہ آئیں اور دیکھین کہ جو پودا سرسیدؒ کی کوششون سے اس سرزمین میں لگایا گیا تھا آج وہ کسقدر بلند بالا اور سرسبز و شاداب ہے۔ سرسیدؒ کا حقیقی اصول یہ تھا کہ جدید مشرقی اصول پر مغربی تعلیم دیجائے اور مذہبی پابندیان بالخصوص مطمح نظر رکھی جائیں۔ اس اصول کو جانشینان سرسیدؒ نے پوری ہمدردی اور مضبوط استقلال سے نباہا۔ چنانچہ یونیورسٹی کی سند مذہبی تعلیم کی تکمیل کے بعد دی جاتی ہے، سنیون اور شیعون کے لئے جدا جدا مذہبی تعلیم کا انتظام ہے، تفسیر و حدیث کا درس دیا جاتا ہے اور قرآن شریف پڑھانے کے لئے حفاظ مقرر ہیں، ایران عرب ترکی چین اور افریقہ تک سے طلبا، بغرض تعلیم علیگڈھ آتے ہیں اور یونیورسٹی کا دروازہ جملہ اقوام عالم کیلئے

کھلاڑی ہے جس سے یونیورسٹی نے ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

یونیورسٹی میں جسمانی تربیت، حفظانِ صحت، قومی امانت اور تحفظ عقیدت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔
ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں اس یونیورسٹی کے کامیاب طلبا حکومت یا قوم کے کسی شعبے میں برسر کار نہ ہوں۔

نظام تعلیم نظام تعلیم چار شعبوں پر منقسم ہے (۱) مسلم یونیورسٹی (۲) انٹرمیڈیٹ کالج (۳) مسلم یونیورسٹی اسکول اور (۴) برانچ اسکول ان چاروں شعبوں میں طلبا کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے جو انیس ۱۹ اصنافِ علم میں تعلیم پاتے ہیں۔ ادب انگریزی، تاریخ، اقتصادیات، ریاضی فلسفہ، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، جغرافیہ، دینیات، طبعیات، علم الکیمیا، علم حیوانات، علم نباتات، قانون، وغیرہ۔ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس وقت ۲۱ ہزار کتابیں موجود ہیں اور ہر سال اُن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

خصوصیات مسلم یونیورسٹی میں جدید مغربی تعلیم کے دوش بدوش مذہبی تعلیم کا انتظام نہایت معقول ہے رزیڈینشل اُصول کے مطابق دار الاقامہ قائم کئے گئے ہیں غریب مسلمان طلبا کو وظائف دیے جاتے ہیں اور قرض حسنہ کی صورت میں اُن کی امداد کی جاتی ہے جس قدر مسلمان گریجویٹ اور تمام یونیورسٹیوں سے نکلے ہیں قریب قریب اتنے ہی صرف اس ایک تعلیم گاہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

ناظمانِ رفتہ مسلم یونیورسٹی جب تک صفحۂ عالم پر ابیر گاہ بنی رہیگی۔ نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، جسٹس سید محمود۔ اور نواب محمد اسحاق خاں کی تدابیر منزل رسی پر تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی۔ مولانا حالی اور علامہ شبلی کی عالمانہ کوششیں ہمیشہ قلوب کو تازہ کرتی رہیں گی اور لارڈ لیٹن اور ٹب مارسین اور آرنلڈ کی ہمدردیاں یورپین اخلاق وکشادہ دلی کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیں گی۔

اراکین عہد عالیہ حضرت بیگم صاحبہ بھوپال بالقابہ (دام اقبالہا) یونیورسٹی کی چانسلر، آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر اور ڈاکٹر ضیاء الدین پرو وائس چانسلر ہیں۔ مسٹر سید سجاد حیدر بی اے رجسٹرار ہیں۔ یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں منتخب فضلاء و علما اور ماہرین علوم مشرقی و مغربی نظر آتے ہیں۔

مآل ظاہر ہے کہ ایسی عظیم الشان درسگاہ کے نصب العین کی تکمیل کے لئے اصرافِ کثیر کی ضرورت ہے۔ رؤسا و امرائے ہند یونیورسٹی کی اعانت کشادہ دلی سے فرما رہے ہیں پھر بھی یونیورسٹی کو ایک معتد بہ رقم کی ضرورت ہے تاکہ تمام ضروری شعبوں میں مرکزی دار العلوم کی حیثیت کے مطابق ساز و سامان کا

اضافہ کیا جائے اس مطالبہ کے لئے ارباب یونیورسٹی نے ایک اپیل شائع کی ہے جسے ہم انھیں کے الفاظ میں پیش کرکے تمنائی ہیں کہ قوم اس واحد درسگاہ اسلامیہ کے قیام واحیا میں پورے تحیّر کو ملحوظ نظر رکھیگی اور یونیورسٹی کا مطالبہ حسب ضرورت پورا کر دیا جائیگا۔ اڈیٹر

اپیل

قوم سے نہایت ادب کے ساتھ التجا ہے کہ وہ اپنے مرکزی دار العلوم کے پروگرام کی تکمیل کی طرف مستقل عزم اور پورے اہتمام کے ساتھ متوجہ ہو۔ اس مقصد کے لئے تقریباً دو کروڑ روپیہ نقد اور پچاس لاکھ سالانہ کی ضرورت ہے بعض اصحاب سوال کرتے ہیں کہ اس قدر بڑی رقم اور آمدنی کا کیا ہوگا۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ کسی رقم کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا انحصار اس نصب العین پر ہے جو قوم کے آئندہ حالات اور ترقی کی نسبت ہمارا ہے یا ہونا چاہیئے جو تخمینہ پیش کیا گیا ہے وہ اس خیال سے کیا گیا ہے کہ ہماری قوم کے لئے زندہ اور با اقبال قوموں کے ہم پلہ ہونے کے اسباب مہیا ہوں قابل غور یہ امر ہے کہ اس زمانہ میں ترقی یافتہ اقوام اپنی تعلیم پر کس قدر خرچ کرتی ہیں انگلستان کی کل آبادی سے ہندوستان کے مسلمان تعداد میں تقریباً ڈھائی کرور زیادہ ہیں باایں ہمہ انگلستان میں قوم کی تعلیم کا جو اہتمام ہے اور اس پر جو خرچ ہوتا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ علاوہ ان متعدد یونیورسٹیوں اور مختلف اقسام کے کالجوں اور تعلیم گاہوں کے جو ملک کے ہر ایک حصہ میں کثرت سے موجود ہیں صرف آکسفورڈ اور کیمبرج کے نظام تعلیم پر تقریباً تین کرور روپیہ سالانہ خرچ آتا ہے یعنی تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ آکسفورڈ پر اور ایک کرور پینتیس لاکھ کیمبرج پر۔ اس کے علاوہ ان دونوں یونیورسٹیوں میں عمارات اور سازوسامان جو کچھ اور جس قدر ہیں ان کی لاگت اور قیمت کا اندازہ کروروں سے بھی زائد ہے ایسی حالت میں اگر ہم اپنی قوم کو اس زمانہ کے معیار کے مطابق ترقی دینا چاہتے ہیں تو اس کے لئے لازمی ہے کہ موجودہ عہد میں علوم اور فنون جس اعلے درجہ پر پہنچ گئے ہیں اس کے مطابق اپنی قوم کی تعلیم اور تربیت کے لئے سامان کیا جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے مرکزی دار العلوم میں اساتذہ اور سازو سامان دور جدید کے اعلے پیمانہ کے مطابق مہیا ہوں اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باوجود اس حقیقت کے کہ ملک کے مختلف حصص میں جس قدر گورنمنٹ کی اعلی سے اعلے تعلیم گاہیں ہیں ان سے سب سے زیادہ ہندو مستفید ہو رہے ہیں انھوں نے بنارس میں اپنا قومی تعلیمی مرکز قائم کیا ہے جس کی ترقی اور تکمیل کے متعلق فی الحال ان کا اندازہ یہ ہے کہ کم از کم دس ہزار ہندو طلباء کے لئے اعلی تعلیم کی تمام ضروریات بڑے پیمانہ پر مہیا کی جائیں۔ چنانچہ طلباء کے رہنے اور پڑھنے کے لئے عمارات کا نقشہ انھوں نے اسی اصول پر قرار دیا ہے اس خیال سے کہ مسلمان طلبہ ملک کے

دور دراز مقامات سے زیادہ تر علیگڈھ آنا پسند کرتے ہیں اور گورنمنٹ کے کالجوں میں کم داخل ہوتے ہیں ہماری قومی ضرورتوں کا اقتضا یہ ہے کہ ہم بھی کم از کم پانچہزار مسلمان طلبا کی اعلیٰ تعلیم اور تربیت کے لئے پورے پیمانہ پر ہر ایک ضرورت کو مہیا کرنے کی کوشش کریں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ آج دنیا کے بہترین علمی مرکزوں میں جو علوم اور فنون پڑھائے جاتے ہیں ان کے لئے یہاں پورا اہتمام ہو۔ اس کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ اساتذہ موزوں اور کافی پختہ عمارات اور جدید سے جدید ساز و سامان مثلاً پانچہزار طلبا کے رہنے کے مکانات کے لئے تقریباً چالیس لاکھ چاہئیں۔ انجنیری اور ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے محض عمارات اور ساز و سامان کے لئے تقریباً پچاس لاکھ چاہیئے سائنس کالج کے لئے پندرہ بیس لاکھ عمارت اور ساز و سامان کے لئے چاہئیں ان کے علاوہ دوسرے متعدد مضامین کے لئے عمارات اور ساز و سامان چاہئیں جس کی مجموعی لاگت اور قیمت ایک کرور سے کم نہ ہوگی اس طرح پر سات کرور مسلمانوں کے مرکزی دار العلوم کے لئے دو کرور کا اندازہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ پچاس لاکھ سالانہ آمدنی جن مقاصد کے لئے درکار ہے وہ ظاہر ہیں پانچہزار طلبا کے لئے اعلیٰ درجہ کا اسٹاف مہیا کرنے کے لئے اس زمانہ میں جس قدر مستقل خرچ کی ضرورت ہے اُس کا اندازہ مشکل نہیں ہے مسلمانوں کے افلاس کے لحاظ سے کم از کم دو ڈھائی ہزار غریب مگر ہونہار طلبا کے لئے وظائف اور قرض حسنہ کے لئے بہت بڑی رقم ہر سال چاہیئے آجکل ہر سال داخلہ کے وقت جو دلدوز منظر یونیورسٹی میں ہوتا ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ سر سید علیہ الرحمۃ مسلمانوں سے فرمایا کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ تم اُس وقت جاگو جب کہ جاگنا بے سود ہو جائیگا آج ہمارے سامنے یہی کیفیت ہے کہ غریب مسلمانوں کے بچے پڑھنا چاہتے ہیں مگر افلاس کے سبب سے مجبور ہیں ہر سال ڈیوٹی کے ذریعہ سے اور اپنے دوستوں سے مانگ کر غریب طلبا کی ایک حد تک کفالت کیجاتی ہے لیکن یہ تمام ذرائع نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ غیر مستقل بھی ہیں قوموں کی تعلیم ایسے طریقوں سے نہیں ہوسکتی اب ضرورت اسکی ہے کہ قوم کی طرف سے اس قدر سرمایہ وظائف اور قرض حسنہ کیلئے مہیا کر دیا جاوے کہ کم از کم اڈھائی ہزار غریب مگر ہونہار اور محنتی طلبا اطمینان قلب کیساتھ تعلیم حاصل کرسکیں اس مقصد کیلئے نو دس لاکھ روپیہ سالانہ کی ضرورت ہے پس اگر ان تمام حالات کا لحاظ کیا جائے تو جو اندازہ پیش کیا گیا ہے وہ کچھ بھی زیادہ نہیں ہے ضرورت صرف اس کی ہے کہ قوم انحطاط اور آئندہ فلاح کیلئے حقیقی اسباب سے آگاہ ہو اور بڑے پیمانہ پر اہتمام کرے اگر حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے سات کرور مسلمان ہر سال شادی اور غمی کی تقاریب میں مزاروں اور منتوں اور دوسرے عقائد پر کروروں روپیہ صرف کرتے ہیں گو ایسے اخراجات سے کوئی حقیقی نفع نہیں برخلاف اسکے تعلیم پر خرچ وہ تجارت ہے جسکی نسبت صداقت کیساتھ اور نتائج کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے "یہ سودا نقد ہے اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے"۔ بہرحال مسلم یونیورسٹی قوم کی جائداد ہے اسکی اصلاح اور ترقی کی جو شکل ہے وہ قوم کیسامنے پیش کر دیگئی ہے اب قوم کو اختیار ہے جو مناسب سمجھے وہ کرے۔

مسلم یونیورسٹی سے خطاب

(از علامہ سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی)

اے عروسِ علم اے روحِ عمل عمرت دراز! — کچھ مجھے کہنا ہے تجھ سے بربنائے امتزاز

مصلحت نے مغربی قالب میں ڈھالا ہے تجھے — تیرے نغمہ میں حجازی ہو گو کلیسائی ہو ساز

کھینچ لیگی قلب جس پردہ میں بول اٹھیگی تو — پاسِ بربط کر نہ اے موسیقیِ بربط نواز

دلفریبی عالمِ مغرب کی دامن کش سہی — ہے بہت باقی ابھی سیرِ خمِ زلفِ ایاز

جادۂ تجدید میں اپنی الگ دنیا بنا — ڈھونڈنے آئے جسے نظارۂ مغرورِ ناز

دے سکے تیری نوا پیغامِ تسکیں قوم کو — بن سکے صورِ حقیقت تیرا آہنگِ مجاز

ارتقا کی دوش پر خود عرش ہو تیرا عروج — طرز میں اک اعتلا ہو وضع میں اک امتیاز

جذبۂ پابندیِ تقلید کو تعطیل دے

درسِ دیرینِ حرم کو فرصتِ تکمیل دے

مختر عانِ علم البرق

قریباً سات سو سال قبل از مسیح ایک نادرِ روزگار تھیلز (Thales) تھا اُس نے معلوم کیا تھا اگر کہربا کسی دھات سے رگڑا جائے تو اس میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ سریا کی ایک عورت کہربا کے ذریعے کپڑوں سے چمٹے ہوئے تنکے کھینچ لیتی تھی۔

مشہور مصنف پلنی (Pliny) جو ۶۲ سال قبل از مسیح پیدا ہوا اور ۱۱۳ء میں مرگیا۔ کہربا اور اس کے خواص لکھ گیا ہے، وہ کہربا اور چمک پتھر (سنگ مقناطیسی) کو متحد الخاصیت اور متحد الماہیت قرار دیتا ہے۔

پندرھویں صدی کے خاتمہ تک علم البرق میں دنیا نے دلچسپی نہیں لی لیکن نئی صدی کے شروع ہوتے ہی دنیا علم البرق میں گہری دلچسپی لینے لگی۔

فلسفی ولیم گلبرٹ (William Gilbert) جو ملکہ الزبتھ کا ڈاکٹر تھا، نے پلنی کے نظریہ کو پرکھنے کے لئے کئی ایک تجربات کرنے کے بعد اعلان کیا کہ "کبریت، لاکھ، جوہر، ٹھوس دسوپ، اور چٹانی نمک میں کشش ہے دھاتوں اور چھپروں کے کھینچ لینے کی"

پہلا اور فقط پہلا مادہ کہربا ہے جس میں پہلے پہل کشش کا ہونا پایا گیا ہے۔

ڈاکٹر گلبرٹ علم البرق کا باپ سمجھا جاتا ہے ۶۳ سال کی عمر پائی اور ۱۶۰۳ء میں مرگیا۔

گلبرٹ کا جانشین آئرلینڈ کا ایک باشندہ رابرٹ بایل (Robert Boyle) ولد ارل آف کارک تھا۔

بایل ۱۶۲۷ء میں منسٹر میں پیدا ہوا اور ۱۶۹۱ء میں مرگیا اس نے مخراج ہوا (Air Pump) ایجاد کرکے دنیا میں ہوا کی تمام خاصیتیں بے نقاب کردیں۔

بایل کی وفات کے ۵ سال بعد اٹو ون گوئرک (Otto Von Guericke) اٹھا جس کے کارناموں سے مغرب گونج اٹھا۔

۱۶۰۲ء میں پرشیا میں پیدا ہوا، اعلےٰ پیمانہ پر تعلیم حاصل کرکے انگلینڈ پہنچا، وہاں سے اپنے تمام ہمعصر سائنس دانوں سے واقفیت اور تعارف حاصل کیا۔ جلد ہی ایک دوسرا مخراج ہوا ایجاد کیا، لیکن

بائیل کی ایجاد سے لگانا نہ کھا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا جلد ہی اس کی ایجاد کو بھول گئی۔

اس کی عالمگیر شہرت کا سبب ایک تجربہ ہے۔" خلائی عظیم الشان طاقت"۔
دو دہانی نصف کرے لئے، جن کے کنارے آپس میں ملے ہوئے تھے، سوراخ سے اندر کی ہوا خارج کرلی۔

ایسا کرنے کے بعد کروں کے کنارے اس مضبوطی سے مل گئے کہ پندرہ بیلوں کی متفقہ طاقت بھی انھیں جدا نہ کرسکی۔

اس کا دوسرا کارنامہ برقی روشنی کی ایجاد ہے ایک شیشے کے کرے میں کبریت کی گیند بنائی، شیشے کو اوپر سے توڑ دیا، اور کبریت کی گیند نکال لی، اندھیرے میں اسے جو رگڑا تو روشنی کے ہمراہ آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ثابت کیا کہ وہ اشیاء جنھیں رگڑ سے برق نہ پہنچائی گئی ہو دوسری ان اشیاء سے جنھیں برق پہنچ چکی ہو، ٹکرا کر وہی خاصیت پیدا کرلیتی ہے۔

گوریک کی شہرت ساتھ سر اسحاق نیوٹن کا ایک تجربہ مدتوں یاد کیا جائیگا' وہ یہ ہے۔" اگر (Dise Gloss) ایک پیتل کے سلنڈر میں رکھکر اسے برق پہنچائی جائے تو وہ کاغذ کو اپنی کشش سے سلنڈر میں کھینچ لیتا ہے۔

گوئیرک کے بعد فرنسز ہاکس بی (Francis Hawksbee) اٹھا اور ۱۷۰۵ء میں رائل سوسائٹی کا ممبر منتخب ہوتے ہی عالمگیر شہرت حاصل کرلی۔ اس کے زیادہ تر تجربات ہوا اور سیماب کے متعلق ہیں اس نے ایک چھوٹی سی الیکٹرسٹی پیدا کرنے کی مشین تیار کیا اور ثابت کیا کہ برقی شعلوں سے جو صدا پیدا ہوتی ہے وہ بجلی کے مشابہ ہے۔ اس کے لڑکے نے بھی ایک سائنٹفک آلات تیار کئے یہی پہلا شخص ہے جس نے لندن میں اپنے نظریئے تجربوں کے ذریعے ثابت کئے۔

اس نے اپنے انکشافات پر ایک کتاب لکھی، جس کا ترجمہ فرانسیسی اور اطالوی زبان میں ہوچکا ہے' علم البراق کا تمام تر انحصار اسی کتاب پر ہے۔

اس کے بعد اسٹیفن گرے لندن میں اٹھا' یہ دراصل بلیو کوٹ کا ایک لڑکا تھا جس نے حالات کی موافقت سے اپنی زندگی علم البرق حاصل کرنے کے لئے وقف کردی' اس کی شہرت کا سبب اس کا ایک تجربہ ہے جس کی بناء پر اس نے کئی ایک اور نادر انکشافات کئے' وہ یہ ہے:۔

ایک شیشے کی نلی لیکر اس کے دو ٹکڑوں پر کاگ لگا دیئے اور ایک کاگ کے ساتھ ہاتھی دانت کا بال چپٹا دیا شیشے کو رگڑنے سے الیکٹرسٹی ہاتھی دانت کے بال تک پہنچ گئی۔

اس کے بعد اس نے برقی رو ۸۰۶ فٹ لمبے تاگہ کے ساتھ پہنچائی۔
یہی تجربات ایک فرانسیسی ڈوفے (Du Fay) نے کئے ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوا
اور چالیس سال کی عمر میں گرے کی وفات کے تین سال بعد مر گیا۔
اس نے ایکٹریسٹی کی دو قسمیں مثبت (Positive) اور منفی (negative)
بھی دریافت کیں۔
ایک راہب کیناکس (Coneus) مشہور موجد دن کیلی اسٹ (Von Kelist)
اور ایک پروفیسر مس چن بروک (muschenbroeck) کو ہالینڈ کی فضا میں ایک وقت ایک ہی
خیال پیدا ہوئے، ان کی کوششوں کا نتیجہ (Leyden Jar) ہے۔ ( )
ایجاد تو ہالینڈ میں ہوا لیکن اس کی تکمیل لندن میں سر ولیم واٹسن کے ہاتھوں ہوئی۔ واٹسن ایک غریب
تاجر کا لڑکا تھا۔ لندن ۱۷۱۵ء میں پیدا ہوا اس کے بعض برقی طاقت کے متعلق تجربات نے دنیائے
سائنس میں تہلکہ مچا دیا۔
امریکہ کا سب سے بڑا آدمی بن جمن فرینکلن (Benjamin Franklin) ۱۷۰۶ء میں
بوسٹن کے قریب پیدا ہوا، اسکول میں معمولی تعلیم حاصل کر کے اپنے بھائی کے ایک معمولی مطبع میں کام
کرنا شروع کیا وہ غریب تھا لیکن قسامِ ازل نے دماغ زرخیز دیا تھا اس نے اپنا تجارتی کام نیویارک فلاڈلفیا
اور لندن میں خود چھپر کر کیا۔ جلد ہی فلاڈلفیا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ اُس کی ہر دلعزیزی کے
سبب ملک نے متفقہ طور پر اپنا نمائندہ قرار دیکر انگلینڈ بھیجا، کیونکہ امریکہ کی نوآبادیوں اور برطانیہ میں
جنگ چھڑ چکی تھی لیکن تصفیہ نہ ہو سکا، فرینکلن بصد مایوسی واپس امریکہ آگیا۔ آتے ہی ایک کمیٹی مقرر کر کے
خود مختاری کا اعلان کر دیا، بعدہٗ اسے سفیر اعظم مقرر کر کے فرانس بھیجا گیا تاکہ برطانیہ کے خلاف مدد
حاصل کر سکے۔

اس کی دوسری نیک تحریک " غلاموں کی تجارت کا انسداد " ہے یہی تحریک اسے قبر تک
لے گئی یہ اس کے سیاسی اور قومی کارنامے ہیں اب ہم اس کے علم البرق کے متعلق تجربات بیان کرتے
ہیں مطالعہ کے دوران میں وقت نے مساعدت کی اور تجربات کرنے شروع کئے۔
یہی پہلا شخص ہے جس نے دریافت کیا کہ الکٹریسٹی اور بجلی ایک چیز ہے لیکن اُسے تجربات
سے پہلے اس نظریہ میں کچھ پس و پیش تھا۔
ایک ریشمی پتنگ بنایا اس کی چوٹی پر ایک مہین تار اور ریشمی فیتہ لگا دیا، جہاں فیتہ اور

ڈور ملتی تھی وہاں ایک دھاتی کنجی لٹکا دی، ایک روز جبکہ آسمان ابر آلود تھا، پتنگ اتنا اونچا اڑایا کہ اس ابر کے ٹکڑے تک پہنچا دیا جہاں بجلی چمک رہی تھی۔ اپنے دروازہ میں بیٹھکر اپنے معصوم بچے کا انتظار کرنے لگا ایک بادل بغیر کسی مظاہرے کے گزر گیا، دوسرے بادل کا گذرنا تھا کہ ڈور کھچنے لگی، جونہی اس معلق دھاتی کنجی کو ہاتھ لگایا ایک پرزور دھکا لگا، اور ساتھ ہی برقی شعلہ نظر آیا، مینہ برسنے لگا۔

۱۷۵۲ء میں اس نے قطعی ثابت کردیا کہ الکٹرسٹی اور بجلی ایک جز ہیں۔

آخر ۱۷۹۰ء میں راہگرائے عالم بقا ہوا۔

دعوے کی تصدیق عمل اور صرف عمل سے ہوتی ہے، علم البرق کے نئے تجربات روز بروز دنیا کو محو حیرت کئے دیتے تھے جان کانٹن (Johan Conton) ۱۷۱۸ء میں سٹراوڈ (   ) میں پیدا ہوا۔ یہ ایک معلم تھا اس نے کئی ایک برقی آلات ایجاد کئے، سب سے اول اس نے ایک مضبوط مصنوعی مقناطیس بنایا۔ اس کا دوسرا امر کے کا کام یہ ہے کہ اس نے معلوم کیا کہ کمرے کی ہوا (Electrified) کی جا سکتی ہے۔

بکیرا (Baccaria) ایک اطالوی تھا اس نے معلوم کیا تھا اگر (Electrified) شئے کے قریب ہوا پہنچے تو خود ہوا بھی (Electrified) ہو جاتی ہے۔

ہنری کونڈش (Henry Covendish) ڈیوک آف ڈیون شائر دوم کا پوتا تھا نالسی میں ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا ہنری امیر تھا، لیکن اس کے عادات اور اخلاق کچھ عجیب سے تھے وہ بہت شرمیلا تھا جس کے سبب وہ بہت کم ملتا جلتا تھا محلوں میں رہکر زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا حتی کہ اس کے نوکروں کو بھی اس کے دیکھنے کا کم موقع ملا ہوگا اس کی زندگی کا مشغلہ سائنس اور فقط سائنس تھی اس نے الکٹرسٹی کی مدد سے آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں کو پھاڑا تو نتیجہ یہ ہوا کہ صاف پانی بچ رہا۔

ہنری ۱۸۱۵ء تک اس تیرہ خاکدان ارضی میں رہا، اس کی زندگی میں دو شخص اٹھے جنہوں نے الکٹرسٹی ایک نئے طریقہ سے پیدا کرنی شروع کی۔

ایک لونگی گلوانی (Luigi Galvani) اطالوی ۱۷۳۷ء میں بلوگنا (Bologua) میں پیدا ہوا اور ۱۷۹۸ء میں مرگیا۔

دوسرا الیکزنڈر وولٹا (Alexandro Volta) تھا ۱۷۴۵ء میں کومو (Como) میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۷ء میں اپنے مسقط الراس میں رہگرائے عالم بقا ہوا۔

ان دونوں کے نظریوں میں تباین و تفاوت تھا۔

ولٹا نے علم کیمیا کے ذریعہ الکٹرسٹی پیدا کی اس کی قابلِ قدر ایجاد "Voltaic Cell" ہے جو آج تک عمل کیمیا کے ذریعے الکٹرسٹی پیدا کرتے وقت کام آتی ہے، اس ایجاد سے سر ہمفری کو چنک لگی اس نے برقی شعلوں کا انکشاف کیا جس سے آج ہم برقی روشنی لے رہے ہیں پروفیسر ارسٹڈ (Orsted) جو کوپن ہیگن میں رہتا تھا اس نے سنہ ۱۸۲۰ء میں ثابت کیا کہ اگر برقی رو (Voltaic Battery) سے تار میں گزاری جائے تو کمپاس کی سوئی اپنی حالت یکسر تبدیل کر لیتی ہے " یعنی برقی مقناطیسی قوتِ جاذبہ" میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

میچل فارڈے (Mishael Faraday) پہلا انگریزی فرزند ہے جو دنیائے سائنس میں آفتاب بن کر چمکا۔ لندن سنہ ۱۷۹۱ء میں ایک لوہار کے ہاں پیدا ہوا، معمولی تعلیم کے بعد جلد سازی کا پیشہ سیکھا، دن کو جلد سازی کا کام کرتا تھا اور رات میں سائنس پڑھتا تھا ایک روز میچل ایک انسائیکلوپیڈیا نہایت ہی غور و خوص سے پڑھ رہا تھا، اس کی دکان سے ایک شریف انسان کا گزر ہوا تو وہ یہ دیکھ کر متحیر ہو گیا کہ ایک لڑکا الکٹرسٹی کا باب جو نہایت ہی ادق ہے کس مزے سے پڑھ رہا ہے۔

اُس شریف انسان نے میچل کو مسٹر ہمفری ڈائی (Humphry Davy) کے لکچر کے داخلہ کے لئے چار ٹکٹ دیئے میچل اتنا خوش ہوا کہ شاید اسے سات بہشت مل گئی۔ وہ لکچر پر گیا اور وہاں نوٹ لئے لکچر کے خاتمہ پر وہ نوٹ مرتعش ہاتھوں کے ساتھ سر ہمفری کے سامنے بڑھائے، ہمفری متحیر رہ گیا کہ لڑکے نے تو غضب کر دیا کس خوبی سے نوٹ لئے ہیں، میچل نے اپنا مطمح نظر سر ہمفری پر ظاہر کیا کہ "میں سائنس داں بننا چاہتا ہوں" ہمفری نے اسے مددگار مقرر کر کے اُسے تعلیم میں مدد دی فرے ڈے کی زندگی کا ہر ایک واقعہ اور ہر ایک کام بذاتِ خود ایک تجربہ ہے۔

وہ اَدق سے اَدق مضامین اس سہل طریقہ سے سمجھایا کرتا تھا کہ بچے بھی سمجھ لیتے تھے۔

سب سے اول اس نے ارسٹڈ کے نظریہ میں اصلاح کی ولیم سٹرکس ( ) نے جب سنہ ۱۸۲۶ء میں ایک نہایت ہی گراں قیمت پر برقی مقناطیس بنایا تو فرے ڈے نے ایک معمولی لوہے کے ٹکڑے اور چند تاروں سے کام لیکر وہی خاصیتیں پیدا کر دیں۔

جیمس کلرک مکسول (J. Clark Maxwell) اسکوچ تھا اڈنبرگ سنہ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوا۔ اڈنبرگ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے کیمبرج پہنچا وہاں نام اُچھالا کر پروفیسر مقرر کیا گیا۔

جن ایام میں فرے ڈے "مقناطیسی اور الکٹرسٹی" کے باہمی رشتوں پر تجربات کر رہا تھا اِسنے علمِ ریاضی کی مدد سے ثابت کیا کہ " الکٹرسٹی ایتھر کے ارتعاش کا سبب ہوتی ہے۔ روشنی اور حرارت بھی

ایتھر میں تموج برپا ہونے کے باعث ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس برقی ارتعاش کی یہ خاصیت ہے کہ جس چیز پر پڑے اس میں برقی رو بڑی آسانی سے دوڑنے لگتی ہے"۔

بعد میں یہی اصول تار کے بغیر پیغام رسانی کا سبب ہوا۔

کلرک مکسول نے اس اصول پر ایک کتاب لکھی، لیکن جلد ہی ۱۸۷۹ء میں مرگیا۔

اس اصول کی تلقین کے لئے ہمبرگ کے شہر میں ہنرچ روڈلف ہرٹز (Heinrich Rudolph

اٹھا ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا بیس سال کی عمر میں میونخ یونیورسٹی میں انجینیرنگ کا کام سیکھا۔ اس پیشہ سے جی اُچاٹ ہوگیا۔ برلن یونیورسٹی میں علم سائنس کا مطالعہ شروع کیا، ۲۳ سال کی عمر میں وہ نام پیدا کیا کہ "ڈاکٹر" کی ڈگری حاصل کرلی۔ جلد ہی کیل یونیورسٹی میں انسٹرکٹر مقرر کیا گیا۔ مکسول کے نظریات کا کیل میں بخوبی مطالعہ کیا۔ حتیٰ کہ ایتھر کے ارتعاش کی رفتار بھی دریافت کرلی۔ کیل یونیورسٹی سے بان یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۹۴ء میں سپرد خاک ہوا۔

کلرک میکسل اور ہرٹز کے اکتشافات سے اطالوی گگ لیمو مارکونی (Guglielmo Marconi) نے فائدہ اٹھاکر "پیغام رسانی بے تار" ایجاد کرکے انسان کے تمدن میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔

علم البرق کی تکمیل میں آخری ہاتھ سر جوزف تھامسن (Sir Joseph Thomson) کا ہے۔ انگلنڈ میں مانچسٹر کے قریب ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اونز کالج مانچسٹر میں تعلیم حاصل کرکے کیمبرج پہنچا وہاں میکسل کی طرح علم ریاضی میں نام اچھال کر پروفیسر ہوگیا بعدہٗ رائل انسٹی ٹیوشن میں پروفیسر مقرر کیا گیا (اس کا معرکۃ الآرا کام جزو لایتجزا کی تعلیم ہے۔

* * *

حاجی محمد صادق اٹولی

سرسید کی لوح تربت

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
شہر جو اجڑا ہوا تھا اسکی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
پاک رکھ اپنی زبان تلمیذ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اقبال

تاریخ پر ایک اجمالی تبصرہ

سچائی کا ہر نکتہ جمالِ حق کی تمام دلفریبیوں کا ایک دھندلا مرقع ہے اسی لئے انسان کی سچی سرگزشت کے طالب علم، اوراقِ پارینہ اور قصصِ گم گشتہ کی تلاش و تحقیق میں سرگرداں نظر آتے ہیں وادیٔ نیل اور زمین دجلہ کو کھود کھود کر الٹ پلٹ کیا جا رہا ہے کہ شاید مدفون آثار و کتبات سے انسانی تمدن کے ابتدائی نقوشِ قدم کا صحیح اور معتبر سراغ مل جائے "اثریات" سے تاریخ کا مرتب کرنا تو گویا گونگے کی شہادت پر مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے لیکن تحریری تاریخ میں بھی صداقت ملوک و امرا کی خودپسندی اور اہل قلم کی دروغ بافی کے طوماروں میں کچھ اسطرح دب گئی ہے کہ اسے ڈھونڈ نکالنا شاہ **توتن خامن** کا دفینہ دریافت کر لینے سے کم حیرت انگیز و دشوار نہیں ہے۔ نوعِ بشر پر دنیا میں جو کچھ گزرا اس کی سچی روداد کا ہر فقرہ سالہائے دراز کی شدید محنت و جگرکاوی کے بعد جمع ہوا ہے۔ اور عجب نہیں کہ اسی زحمت و تعب سے گھبرا کر **ہربرٹ اسپنسر** نے تاریخ خوانی کے خلاف اپنا مشہور فتویٰ قلم بند کیا ہو۔

لوگوں نے صداقت کی خوبصورتی کو صنعت کا محتاج سمجھ لیا اس بے شعوری نے رفتہ رفتہ فی الواقع انہیں اصلیت اور تصنع میں امتیاز کرنے کی قوت سے محروم کر دیا انتہا یہ ہوئی کہ قوموں کے عہد انحطاط میں بعض اوقات اصل بالکل محجوب اور فقط بناوٹ، دلکشی کا سامان رہ گئی جسے یقین نہ ہو وہ ذرا ماحول سے آزاد ہو کر اقوام ایشیا کے ادبیات پر غور و تدبّر فرمائے لیکن صداقت پر سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ تاریخ نویسی کو بھی ادبیات کے دائرے میں داخل کر لیا گیا اور وقائع کی بیاض، رنگ آمیزی کے ہاتھوں سے اتنی داغدار ہوئی کہ بزم ثقاہت میں تاریخ کی بے اعتباری ضرب المثل سمجھی جانے لگی مگر ان تمام سوء اتفاقات کے باوجود، اسپنسری خیال کے لوگ یاد رکھیں کہ علوم انسانی میں صرف **تاریخ** ایسا علم ہے جس کے دامن میں سچ اپنی مکمل صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیئے اور ہو سکتا ہے کیونکہ تاریخ کا کام فقط **گزشتہ واقعات** کو بے کم و کاست محفوظ کر لینا ہے۔

جھوٹ کا ایک پیرایہ ملوکی اور قومی تاریخ نگاری ہے۔ صداقت، رنگینی، کی تاب نہیں لاسکتی تو کسی خاص غرض اور مقصد کی متحمل کیونکر ہو؟ مگر ہماری فارسی اور یورپی تاریخوں میں کتنی ہیں، جو محض واقعات جمع کرنے کے شوق میں لکھی گئیں؟ ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے تو دیدہ دلیری کی حد کر دی۔ کہ

اصطبل و فیل خانہ، مطبخ و فراش خانہ کے ساتھ تاریخ نگاری کا بھی ایک باضابطہ کارخانہ قائم کیا اور عہد کے مشہور انشا پردازوں کو اپنے کارنامے لکھنے پر مامور فرمایا قصائد شعرا کی طرح آج یہ تمام دفتر نفس انسانی کی رذالتوں پر گواہی دے رہے ہیں۔

یورپ والوں نے بادشاہوں کی بجائے تاریخ کو اپنے ملک و قوم کی بادخوانیوں کا حیلہ بنایا ہے بعض اوقات یہ لوگ ایسی بے حیائی کے جھوٹ بولتے ہیں کہ آدمی کو ان کی ساری قوم اور تہذیب سے نفرت ہو جاتی ہے حیرت کی بات ہے کہ مُردہ قوموں کی صحیح تاریخ جمع کرنے میں اہل یورپ نے تحقیق و تلاش کا حق ادا کر دیا اور ذہانت و سعی کے عجیب و غریب کرشمے دنیا کے سامنے پیش کئے، لیکن آنکھوں کے روبرو جو کچھ گزر رہا ہے اُسے بیان کرنے کی قدرت نہ پا سکے بیشک صداقت پر قابو پانا مشکل ہے۔ بیشک، سچ کو ڈھونڈنا آسان مگر سچ بولنا دشوار ہے!

انصاف شرط ہے، تاریخ کو اگر حقیقت میں کسی نے "تاریخ" کے لئے لکھا، تو وہ مسلمان عربوں کی قوم تھی عبرت ہوتی ہے کہ اس زمانے کی مسلمان قومیں اسلاف کا ایسا بہتر نقش قدم چھوڑ کے۔ جدید یورپ کی رہنمائی قبول کرنے کی مشتاق ہیں اور تاریخ نگاری کو قوم کی عیب پوشی اور جھوٹی لن ترانی کا ایک وسیلہ سمجھنے لگی ہیں ؏

تاریخ کا مقصد کتنا باعظمت ہے! وہ نہ صرف افراد کو، بلکہ قوموں کو انسانی افعال و اعمال کے صحیح نتائج بتانا چاہتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ اخلاق کی سچی معلمہ ہے کیونکہ وہ اخلاق کی حقیقتوں کو بالواسطہ اور صرف نظائر و شواہد کی صورت میں ونشین کرتی ہے مانا کہ صحیح عمل، صحیح علم کا ہمیشہ پابند و حلقہ بگوش نہیں ہوتا لیکن آدمی نے نسل کی اصلاح و تہذیب کے جو اسباب اپنی کوشش سے مہیا کئے ہیں انکا دائرہ اسی تنگ سرحد سے محدود ہے۔

مذکورہ بالا اس مقصد کو مان لیجیے اور یاد رکھئے تو پھر تاریخ کا شخص یا کسی گروہ سے مخصوص کیا جانا محض بے معنی نظر آئیگا اور ہم اس گُر کو پا جائینگے کہ تاریخ کو **مطلقاً انسانی** ہونا چاہیئے نہ کہ قومی اور ملکی۔ شخصی اور بادشاہی ؏ دوسرے لفظوں میں اسکی اخلاقی قیمت اور سبق آموزی عالم انسانی کیواسطے عام اور عالمگیر ہو۔ اسی طرح جسطرح دوسرے علوم طبیعی کے حقائق، نوع بشر کی مشترکہ ملکیت ہیں۔

میرے بیان سے امید ہے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوگا کہ میں افراد یا اقوام کی علحدہ تاریخ لکھے جانیکے خلاف تقریر کر رہا ہوں میرا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے مجھے اصرار ہے کہ تاریخ کا مقصد صرف صداقت کو محفوظ کر لینا ہو اور اس معیار پر پوری اترنے کے بعد ہر چھوٹی بڑی تاریخ انسان کیواسطے ایک درس بصیرت اور گراں بہا موعظت ہے وہ بعینہٖ قابل قدر شے بن جاتی ہے اور اس صورت میں اقوام و افراد کا باہمی امتیاز تک غائب ہو جاتا ہے یعنی ہر مبتذل سے مبتذل انسان اور گمنام سے گمنام قوم کی سچی تاریخ وہی مرتبہ حاصل کر لیگی جو ابھی تک صرف ملوک و امرا یا اقبالمند و فاتح اقوام کو حاصل رہا ہے حتی کہ ارباب تحقیق کی نظر میں **جعفر زٹلی** کی مرگ و زندگی میں اسقدر دلچسپی اور افادے کا سامان جمع ہو سکیگا جو پہلے **فرخ سیر** کے قتل اور حالات بادشاہی سے مختص تھا بشرطیکہ دونوں صورتوں میں واقعے کی جزئیات یکساں صحت و جامعیت کیساتھ قلمبند کیگئی ہوں

تنقیدِ شعر

(اثرِ مصورِ فطرت مولانا جوش ملیح آبادی)

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو!

شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتلِ عام
برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!

فکر کا جس کی حواسِ ظاہری پر ہو مدار
شاعری کے قصرِ مدہوشی میں پا سکتا ہے بار؟

کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لئے
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لئے؟

غور تو کر دل میں او خو کردۂ غوغائے عام
کرتی ہیں خاموشیاں قدرت کی تجھ سے بھی کلام؟

ملتفت کیا تیری جانب بھی ہے لیلائے حیات؟
محوِ سرگوشی ہے کیا تجھ سے بھی روحِ کائنات!

اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب؟
خاک کو جن کے تبسم نے بنایا ہے گلاب؟

دل سے اپنے پوچھ او زندانیٔ علم و کتاب
حسنِ مطلق کو بھی دیکھا ہے برافگندہ نقاب!

تو پتہ اسرارِ عالم کا لگاتا ہے کبھی؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی!

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تو نے داغ
جس کے پرتو سے غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ!

طورِ فطرت کی بلندی پر بھی چڑھ سکتا ہے تو
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو!

یہ نہیں تو بس وہیں رک جا یہ صحرا اور ہے
تیری دنیا اور ہے شاعر کی دنیا اور ہے

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
شعر کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

"شعر" کیا؟ جذباتِ دل کا ایک نقشِ ناتمام
ایک مبہم سا اشارہ مشتبہ سا اک کلام

نشہ میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی

بے حقیقت نے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پر اک عکس لامحدود کا

سایۂ ابہام میں صورت گری جذبات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی

شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
پنکھڑی پر رات کو شبنم کے گرنے کی صدا

شعر کیا ہے؟ غور کرنا ہے بند آواز سے
دل کی سرگوشی حقیقت کی عروسِ ناز سے

جوئے قدرت کی روانی دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹنا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں

ہاتھ میں جھونکوں کے اک بجھتا ہوا دھندلا چراغ
جھلملانا دل کی شمعوں کا سرِ بزمِ دماغ

"لفظ و معنی" میں توازن کی مسلسل آرزو
"تر زبانی" اور "خاموشی" کی باہم گفتگو

نہر میں حسنِ قمر کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا "قطرے" کے روزن سے "عروسِ سحر" کا

مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

"شعر کی تنقید" سے پہلے مری تقریر سن
محوِ زبانِ شاعری سے شعر کی تفسیر سن

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بیشمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیبِ ادب
اور انھیں دنیا "درِ تاباں" کا دیتی ہے لقب

گو جواہر بن کے ہوتی ہیں وہ زیبِ تاجِ زر
اُن میں لیکن ظلمتیں شاعر کو آتی ہیں نظر

دل میں رہتی ہیں تر و تازہ جو کلیاں زرفشاں
پھونک دیتی ہیں انھیں "الفاظ" کی چنگاریاں

جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے یہ رنگیں شراب
ٹوٹ جاتے ہیں نفس کی زد پر آ کر یہ حباب

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
کاگ کے کھلتے ہی پڑ جاتا ہے اس ساغر میں بال

نطق سے ندرت کبھی ممکن نہیں جذبات کی
خامشی تفسیر ہے باریک محسوسات کی

چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دلِ سرشار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

رہتے ہیں بیدار دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں

کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب بکھرے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے

شاعری کا خانماں لفظوں کا ہے لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا

گوہرِ نایاب جن نظموں کو کہتا ہے جہاں
وہ تو شاعر کے سمندر کی ہیں خالی سیپیاں

قعر سے رقصاں تھپیڑوں نے نکالا ہے جنھیں
نطق کی بے مغز موجوں نے اچھالا ہے جنھیں

سیپیاں امواج کے نغمے سنا سکتی نہیں
کھو گئے ہیں کس جگہ موتی بتا سکتی نہیں

اس تلاطم میں کب اے نقاد ابھر سکتا ہے تو
جب یہ عالم ہے تو کیا تنقید کر سکتا ہے تو

ایک تنکا دخل کیا دیگا بھلا طوفان میں
اور اگر ضد ہے تو آ تنقید کے میدان میں

رنگ جو تو نے چڑھایا ہے وہ سب دھل جائیگا
مصر کے بازار میں کھوٹا کھرا کھل جائیگا

لیکن اتنی بات کا دل میں رہے ہر دم خیال
ننگ ہے شعر و سخن میں مدرسہ کی قیل و قال

اک ترنم سے لبِ تنقید کھلنا چاہیے
قطرۂ شبنم کو برگِ گل پہ تلنا چاہیے

علم تفسیر القرآن

قرآن مجید مذہب اسلام کی آسمانی کتاب ہے لسانِ عرب میں نازل ہوا۔ اس میں جابجا وہی محاورے استعمال کئے گئے ہیں جو عام طور پر متداول تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مخاطبین اس کے مفہوم پر نہایت آسانی کے ساتھ حاوی ہو سکتے تھے فہم مطالب میں ان کو کسی قسم کی دقت یا دشواری نہ تھی کیونکہ ہر آیت کے محل نزول مجمل اور مفصل کی تطبیق۔ ناسخ و منسوخ کے تقدم اور تاخر اور مقتضیاتِ احوال وغیرہ کا پورا علم ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر ایک کا مدعا خود بخود سمجھ لیا کرتے تھے۔

طبقہ تابعین اور تبع تابعین نے صدری تعلیم کے طریقے پر یہ تمام باتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت عبداللہ بن عباس المتوفی سنہ ۶۸ھ وغیرہ سے زبانی سیکھیں یہاں تک کہ مجاہد بن جبیر المتوفی سنہ ۱۰۴ھ مقاتل سلیمان المتوفی سنہ ۱۰۵ھ و ابراہیم بن معقل النفسی المتوفی سنہ ۲۹۵ھ محدث ابو جعفر محمد بن جریر طبری المتوفی سنہ ۳۱۰ھ ابو جعفر واقدی اور ابو اسحاق احمد ثعالبی المتوفی سنہ ۴۲۷ھ و ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی المتوفی سنہ ۵۱۶ھ صاحب معالم التنزیل وغیرہ کا زمانہ آیا۔ ان مفسرین نے صحابہ اور تابعین کے آثار منقولہ کو اپنی تالیفات میں مدون کیا۔ یہ پہلا طبقہ مفسرین کا تھا۔ ان میں محدث ابن جریر کی تفسیر بقول محدثین و فقہا بہترین[1] ہے۔ اسی اثناء میں عجمیوں کے اختلاط سے عربی زباندانی نے ایک فن کی حیثیت اختیار کی اور اس کے مختلف شعبہ (لغت) اعراب۔ تصریف فصاحت۔ بلاغت) وغیرہ مختلف علوم کی شکل میں مدون ہوئے اور قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے ان علوم کے اصول اور قواعد کو آیاتِ قرآنی کے مقاصد پر منطبق کرنا لازم ٹھہرا اور اسی لئے متاخرین کی تفاسیر میں اکثر اسی قسم کی تدقیقات پائی جاتی ہیں۔

متقدمین مفسرین نے اپنی تصنیفات میں آثار منقولہ کو نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن ان کی تفاسیر میں رطب و یابس۔ مقبول و مردود ہر ایک قسم کی روایات پائی جاتی ہیں اور تحقیق بالکلیہ مفقود ہے جس کا سبب یہ ہے کہ عرب اہل کتاب اور تعلیم یافتہ قوم نہیں تھے سادگی اور زود اعتقادی ان کا خاصہ تھا اور چونکہ وہ اہل کتاب کو اہل علم سمجھتے تھے طبعاً ان کے ساتھ ان کو حسنِ اعتقاد تھا اس لئے جب کبھی انھیں اسباب کائنات۔ ابتدائے آفرینش اسرار موجودات وغیرہ حقائق دریافت کرنیکا شوق ہوا جو فطرت انسانی میں داخل ہے تو انھوں نے ایسے مواقع پر اہل کتاب کے ان افراد پر رجوع کیا جو زمرۂ اہل اسلام میں داخل ہو چکے تھے مثلاً کعب الاحبار وہب بن منبہ عبداللہ بن

[1] طبقات الشافعیہ لابن السبکی۔

سلام وغیرہ ان بزرگوں کو اگرچہ تورات وغیرہ کتب سابقہ کا علم ضرور تھا اور اسلام قبول کرنے کے بعد نہایت دیندار اور متقی ہو گئے تھے لیکن اہل بادیہ ہونے کے باعث موٹی سمجھ کے علما تھے تحقیق اور تدقیق کا مادہ ان میں نہ تھا جو کچھ بھی بیان تھا وہ واہی تباہی روایات کا مجموعہ تھا مفسر نے آنکھیں بند کر کے آمنا صدقنا کہکر اسکو قبول کیا۔

متاخرین میں سب سے پہلا شخص ابو محمد بن عطیہ ہے جس نے ان تمام تفاسیر کو چھانٹا۔ آثار منقولہ کی تنقید کی اور اپنی تفسیر میں صرف ان باتوں کو درج کیا جو صحیح اور قابل اعتبار تھیں اس کی تفسیر صرف اہل مغرب میں شہرت پذیر ہوئی۔ مشرق میں علامۂ قرطبی اس کے نقش قدم پر چلا اور اہل مشرق کو ان کے اغلاط پر متنبہ کیا۔[ع]

متاخرین کی تفاسیر میں زباندانی کے متعلق نکتہ آفرینی کا پہلو غالب ہے۔

اس باب میں سب سے بہتر علامہ جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الخوارزمی زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ کی تفسیر کشاف ہے جس میں بلاغت کلام تحقیق محاورات قرآنی۔ نکات عالیہ وغیرہ کا کوئی دقیقہ معرض بحث میں لائے بغیر نہیں چھوڑا اس عدیم النظیر تفسیر کے متعلق علمائے کرام کا یہ فقرہ ہے لولا الکشاف لکان القرآن بکراً علامہ شرف الدین محمد طیبی المتوفی ۷۴۳ھ نے اس پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ آیات قرآنی کو اہل اعتزال کے بیان کردہ معانی پر محمول کرنے سے ان کی بلاغت کالعدم ہو جاتی ہے ان کی بلاغت صرف اس صورت میں قائم رہتی ہے جبکہ ان آیات کو اہل سنت کے مذہب کے موافق لیا جائے[۴]

ان ازمنہ میں علوم عقلیات کا بھی دور دورہ تھا علمائے اسلام ایک طرف تفاسیر کو منقولی مباحث سے مملو کر رہے تھے دوسری طرف علوم فلسفہ سے تشریح و توضیح کیجا رہی تھی ان مفسرین میں سے مشہور ترین افراد ابو مسلم اصفہانی المتوفی ۳۲۲ھ صاحب تفسیر جامع التاویل المحکم التنزیل۔ عبدالرحمٰن ابوبکر اصم عبداللہ بن احمد بن محمود کعبی المعروف ابو القاسم بلخی المتوفی ۳۰۹ھ کان من کبار المتکلمین[۱]۔ محمد بن علی بن المیصل المعروف قفال کبیر المتوفی ۳۶۵ھ کان اماماً فی التفسیر[۲]۔ ان سب کا سرتاج ایمان عقلیات کا مہر منور امام فخر الدین محمد بن عمر رازی المتوفی ۶۰۶ھ صاحب تفسیر مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر۔ امام نے اپنی اس تفسیر میں مسائل اعتقادات کی ایسی تشریح و توضیح کی ہے جو فلسفہ اور عقل کے مطابق ہے اس سے بڑھکر ایک نہایت مہتم بالشان اور قابل قدر یہ کام کیا کہ قرآن مجید کے قصص اور روایات کی صحیح و تشریح کی غرضکہ تحقیق و تدقیق کی حد کر دی ہر ایک آیت کے ما لہ و ما علیہ پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ عالمانہ و فلسفیانہ بحث سے کام لیا ہے۔

ازمنہ متاخرہ میں شیخ ابوبکر محمد علی بن احمد المتوفی ۹۰۸ھ کی تفسیر کتاب الاستغنا ایک صد مجلدات میں ہے۔[۵]

علامۂ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر شافعی سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے درمنثور کے نام سے ایک مبسوط تفسیر ارقام کی جس میں آثار منقول کو نہایت جامعیت کے ساتھ تحریر کیا ہے اور اسکا مقدمہ اتقان فی علوم القرآن جو منجملہ

---

[۱] ابن خلکان۔ [۲] طبقات کبریٰ۔ [۳] کشف الظنون جلد (۱) صفحہ ۹۲ [۴] مقدمۂ تاریخ ابن خلدون۔

علوم قرآنی کے مباحث پر حاوی ہے لکھا ہے۔

علامہ فیضی اکبر آبادی المتوفی سنہ ۱۰۰۴ھ نے تفسیر سواطع الالہام بے نقط عبارت میں لکھی ہے جس میں شانِ نزولِ آیات تحقیق لغت۔ ترکیب نحوی۔ لطائف علم بیان۔ قصص و احکام وغیرہ عالمانہ طرز پر تحریر کیے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی سنہ ۱۱۷۶ھ سرخیل مفسرین ہیں۔ جن کی فوز الکبیر باوجود مغیر الحجم ہونے کے علم تفسیر قرآن کے محققانہ اصول کی نہایت خوبی کے ساتھ جامع ہے۔

عصر قریبہ میں علامہ عبدہ مصری کی تفسیر کے ڈھائی پارہ بھی جدید علم الکلام سے خالی نہیں

انتظام اللہ الصدیقی

اکبر آبادی

شیریں نغمے

از۔ مولوی مسعود علیصاحب بی اے محوی

فروغ طلعت جانِ جہاں گرفت مرا | چہ جلوہ بود کہ آتش بجاں گرفت مرا

بروں ز بزم بہ انداز دلبری فرمود | عیاں گزاشت ستمگر نہاں گرفت مرا

نداشت دانہ خال و نہ دامِ زلفِ دراز | بغیر دانہ و دامم چساں گرفت مرا

نگاہ کردن دزدیدہ ام ببزم بدید | میانِ چیدنِ گل باغباں گرفت مرا

تو معتقد کہ من ایں آستاں گرفتہ بخود | منم بر آں کہ خود ایں آستاں گرفت مرا

بقدر سجدہ اگر جا بر آستانہ دہند | مرا حیاتِ ابد عیشِ جاودانہ دہند

مرو ز راہ بہ افسانہائے حور و قصور | کہ گوشِ دل نہ حریفاں بایں فسانہ دہند

امید داد چہ داوی بہ کشوری کہ در آں | جزائے عشق و محبت بہ تازیانہ دہند

ہزار نالہ کشیدی و زندۂ محوی | وگرنہ خستہ دلاں جاں بیک ترانہ دہند

درسگاہ

تنویرِ صبح کون میں کیا جگمگا رہی ہے
تقدیس کی فضا میں سورج بنا رہی ہے
پنہاں حقیقتوں کے پردے اٹھا رہی ہے
تیری طرف نظر ہے اور مسکرا رہی ہے
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

تاریخ و سیر کا یہ دار المطالعہ ہے
تحقیق کا خزانہ اس میں چھپا ہوا ہے
اے بے خبر مورّخ وجہِ سکوت کیا ہے
تو سر بجیب حیرت خاموش کیوں کھڑا ہے
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

علم و عمل کی قوت تجھ میں اگر نہیں ہے
اے خستۂ جہالت کچھ اسکا ڈر نہیں ہے
معمور دستوں سے تیری نظر نہیں ہے
اپنی ہی کیا کسی کی تجھ کو خبر نہیں ہے
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

یہ شاندار ایواں قصرِ بلند و بالا
پھر اسمیں یہ معلم ممتاز اور یکتا
یہ اُن کی شان اور یہ ایثارِ نفس اُن کا
تدریس کے لئے ہیں تیار بے محابا
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

یہ درسگاہِ رازِ حیرت کی ترجماں ہے
یہ درسگاہِ بزمِ فطرت کی رازداں ہے
یہ درسگاہِ ذہنِ خاموش کی زباں ہے
یہ درسگاہِ شرحِ اسرارِ دو جہاں ہے
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

تو ہمتِ سلف کی اس میں امانتیں ہیں
عہدِ عتیق تر کی اس میں حکایتیں ہیں
اس کے ہر اک سبق میں صد ہا روایتیں ہیں
ذرے نہیں ہیں اسکے محذوف آیتیں ہیں
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

اسکی ہوا میں تجھ کو رنگِ وفا ملیگا
ہر سانس میں زمانہ کھویا ہوا ملیگا
گم کردہ عظمتوں کا اسمیں پتہ ملیگا
منزل یہ جو گیا ہے وہ راستہ ملیگا
چل، درسگاہِ ملت تجھ کو بلا رہی ہے

منظر صدیقی سیمابی اکبر آبادی

ڈراما

انسان

(اثر۔ ساغر نظامی علیگ)

سلسلہ کی ساتویں قسط

دوسرا دور ـــــــــــ نواں منظر

دارالملائکہ

(دنیا کے بیت الغریب میں)

ہاروت و ماروت متحیر و پریشان بیٹھے ہوئے ہیں۔
ایوان تبلیغ پر نیا عالم طاری ہے۔ شمعیں اداس ہیں
اور ایک بامعنی سکوت ہر طرف چھایا ہوا ہے

ہاروت۔ ماروت۔ اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ دنیا میں دامِ حسن کی گرفت اس قدر سخت گیر ہے تو واللہ میں کبھی اصلاح عالم کا ذمہ دار ہو کر یہاں نہ آتا۔

ماروت۔ بیشک اے خدا کے مقرب فرشتے ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس طلسم زار کی تصاویر تصور اس درجہ دل گیر اور صبر شکن ہوں گی، ہم نے انسان کے فطری کمالات کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور یہی غلطی آج ہمیں شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے۔

ہاروت۔ مگر سنو تو، ہم اس وقت دنیا میں ہیں اور دنیا کی گناہگار فضا کا علم و تجربہ ہمیں اس وقت تک کبھی نہیں ہو سکتا جب تک ہم اس فضا میں ایک مرتبہ بالکل کھو نہ جائیں اور ہمیں اس کی پُر فریب گہرائیوں کا غیبی مشاہدہ نہ ہو جائے۔

ماروت۔ ہاں یہ تو صحیح ہے۔
گناہ کا ارتکاب گناہ سمجھکر کرنا گناہ ہے لیکن تحقیق و تدقیق کی نظر سے کسی گناہ میں شریک ہو جانا حدِ گناہ تک نہیں پہنچتا۔

ہاروت۔ یہ آپ نے بالکل درست فرمایا۔

ماروت۔ گناہوں کا انسداد اُن کے مآل کار، اور نتائج معلوم ہونے کے بعد کیا گیا ہے، مثلاً قتل اس لئے گناہ ہے کہ جذبۂ انتقام اور اشتعال طبیعت اکثر بے قصور مخلوق کے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور بغاوت و فساد اس لئے ناجائز ہے، کہ اس سے خدا کی زمین پر بے امنی و بے سلوکی پھیلتی ہے مگر

مگر کسی عورت کے لمس و وصال سے کسی مرد کا رُک جانا کیوں گناہ ہے، جبکہ لمس و وصال کا نتیجہ لذاتِ نفس کے سوا کچھ بھی نہیں، اور لذاتِ نفس ہی ذریعہ ہے انبساطِ روح کا، جب رُوح میں انبساط ہوگی دل خود بخود تزکیۂ خیال کی طرف مائل ہوگا اور عبادات و طاعات کا جذبہ تزکیۂ خیال ہی پہ موقوف ہے لیکن اگر اس کا عملی نتیجہ اس کے خلاف ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں اور علم بغیر عمل ناممکن لہذا.......

ہاروت۔ لہذا ہمیں علم حاصل کرنا چاہیئے۔

ماروت۔ تو بس بندرخت کو پیامِ ہمکناری دو، اور ان اُداس شمعوں کو نوبدرنگ و بُو۔

ہاروت۔ کاش ہمارا اور یہ فیصلہ اس سے پہلے کر دیتا اب اُس کا پتہ بڑی مشکل سے ملیگا۔

ماروت۔ ہاروت، دل کی دھڑکنیں ایک سکون کے لئے بے تاب ہیں، خلوت کی بے کیف خموشی نوائے طرب سے معمور ہونا چاہتی ہے۔ ڈھونڈھ اے رفیقِ فلکی۔ اُس حورِ ارضی کو ڈھونڈھ۔ اور اپنی ملکیت کی قدرت کا ثبوت دے۔ اس سے پہلے کہ چاند اپنی مقررہ منزلیں طے کرے۔ اور چاندنی ضیائے شمع کی طرح اُداس ہو جائے۔ میرے قصرِ بے نور کو بندرخت کے انوارِ جمیل سے جگمگا دے فضائے ارض میں پرواز کر اور اِس لذتِ مجسّم کو جہاں ہو وہیں سے اٹھالا۔

ہاروت۔ ہمارے قصرِ تقدس کے سامان میں آثارِ شگفتگی پنہاں ہیں۔ شمعیں خود بخود کچھ زیادہ روشن ہوتی جاتی ہیں۔ ہوا میں ایک خوشگوار خنکی محسوس ہونے لگی ہے۔ ہمیں کسی امید افزا استقبال کا انتظار کرنا چاہیئے۔

(ایک دربان آتا ہے)

دربان۔ حضور وہ عورت جو ایک روز فریاد لیکر آئی تھی پھر اذن طلب ہے۔

بلاؤ۔ جلد بلاؤ۔ میں دنیا میں ہر فریاد کی داد دوں گا اور بیداد و ستم کی بنیادیں ہلا کر دنیا میں ایوانِ سکون و نشاط کے قلعے تعمیر کروں گا۔

(دربان جاتا ہے)

(بندرخت آتی ہے)

اا اے فرشتوں کی روح کو دعوت دینے والی ساحرہ! آ! کیا تو نے اپنے ظالم شوہر کے دامِ استبداد سے رہائی پائی ــــــ؟

بندرخت۔ نہیں! اے نائبانِ الٰہی۔ اے رسولانِ فطرت، اُس کے ستم، اُس کے ظلم، اس کی جفا، اس کا جور

بدستور صبر آزما ہے میں آئی ہوں، ایک مرتبہ پھر آئی ہوں اگر تم میری داد کو نہیں پہنچ سکتے تو پھر میں دنیا کے ان ستم زور عصیاں پرستوں کی پناہ میں جانے کے لئے تیار ہوں جن کے لئے قتل و بربادی مقابلہ و مجادلہ اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ آپ کے لئے آسمان سے جاکر زمین پہ لوٹ آنا سہل ہے۔

ہاروت۔ ہم تمھاری مدد کے لئے قطعی تیار ہیں۔

ماروت۔ خدا کی کمزور مخلوق کو ستانیوالے یقیناً دنیا میں زیادہ نہیں جی سکتے ان سے دنیا کو خالی کرادینا ہی مصلحت ہے۔

بندرخت۔ بس یہی میری تمنا ہے جس کے بعد اس تنہا دنیا میں آپ کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہوسکتا۔

ماروت۔ ایسا ہی ہوگا، اے ملائک فریب جمیلہ! عورتوں کی اصلاح کے لئے قدرت تجھے بہترین مبلغہ بنانے والی ہے۔

بندرخت۔ تو پھر اپنے قدم کے متبرک سکوت کو جنبش دیجئے میرے ساتھ چلئے اور ان موانعات حائلہ کا فیصلہ کردیجئے

ہاروت۔ تمھاری قیام گاہ کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہوگا۔

بندرخت۔ صرف دوسو منزل کا راستہ ہے۔

ماروت۔ دنیا کی بہترین لڑکی، یہ مسافت و فاصلہ کمزور انسان کے لئے قابل احساس ہوسکتا ہے، مگر ہمیں اس راستہ کے طے کرنے میں ایک لمحہ کا آٹھواں حصہ بھی بہت زیادہ ہے۔

بندرخت۔ میں اس ملکی قوت کا تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔

ہاروت۔ آنکھیں بند کرلو۔

"بندرخت آنکھیں بند کرتی ہے ہاروت و ماروت کے شانوں پر اس کے دونوں ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور ایک فوری پرواز قصر ملکوتی سے انھیں فضا میں بلند کردیتی ہے"

دوسرا دور ———— دسواں منظر

فارس کا ایک ایوانِ زرنگار

(خوابگاہ ژرف)

"ژرف" فارس کا ایک متمول تاجر اپنی خوابگاہ میں آمادۂ خواب ہے"

ژرف۔ بندرخت اب تک نہ آئی۔ یقیناً اس نے دنیا کی بعض مخرب مجالس تخریب کو اپنا مامن بنالیا ہے۔۰۰

گنا ہوں میں، روز نہاتی ہے اور میں اُسے عالم خیال میں بھی تر دامن دیکھتا ہوں، میری یہ آرزو کہ وہ صرف میری عیش گاہ کو گرم رکھے۔ اس کی معصیت کوشی کبھی سرسبز نہ ہونے دیگی آج اُسے گئے ہوئے کتنی مدت ہوگئی، دنیا بھر کا عیش، تمام جہاں کی نعمتیں، جو سمبور اور شراب کے مبادلے میں میں نے حاصل کی ہیں اُسے مسرور رکھنے کے لئے کافی ہیں، مگر اس کا غیر معمولی حسن ہمیشہ فلک پرواز رہا ہے وہ چاند کو اکثر دعوت ہم جلیسی دیتی ہے۔ وہ تاروں سے اکثر آنکھیں لڑاتی ہے وہ چاہتی ہے کہ سمن زار کہکشاں میں صرفِ خرام ہو، وہ آفتاب کے دائرے میں سما جانا چاہتی ہے وہ شام کی دوشیزگی میں جذب ہو جانا چاہتی ہے وہ ایک ما فوق الفطرت لڑکی ہے جس کی طبیعت میں بلندی، فطرت میں پرواز، رنگ میں رمیدگی، اور انداز میں رفعت جھلکتی ہے۔ اس کی جبین کشادہ سے تندرستی اور تجمل کے چشمے بہتے رہتے ہیں اس کی بڑی اور اُبھری ہوئی آنکھیں تمام عالم کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہیں۔ اس کا دراز قامت مضبوط دست وپا اور مرتفع سینہ ایک قوی اور احاطہ آفریں آغوش کا متلاشی ہے اور فارس کی فضاؤں میں اس کے جذبات کو مطمئن کر دینے کی صلاحیت نہیں ہے آفتاب اس کی مدد کرے، اور آتشیں قربانگاہیں اس کے لئے پناہِ حیات ہوں۔

(شراب پی کر سو جاتا ہے)

بندرخت معہ ہاروت و ماروت اسی خوابگاہ میں نازل ہوتی ہے۔"

بندرخت۔ یہی ہے وہ ناقابلِ التفات تاجر جسے میرے شوہر بننے کا حق فضول حاصل ہے میں اسے قتل کر دو اور میری آزادیوں کو پیامِ حیات سے مسرور۔

"ہاروت زرف کیطرف جاتا ہے اور پھر واپس ہوتا ہے"

ہاروت۔ قتل، خون، ہلاکت، غارتگری، فساد، فریب، آہ میری دنیائے محسوسات میں زلزلہ آرہا ہے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، میرا جسم لرزاں ہے، میری آنکھوں میں رات کی سیاہی کچھ زیادہ تاریک ہوتی جاتی ہے ماروت مجھے سنبھالو مشکل ہے اس کام کی انجام دہی مشکل ہے۔

ماروت۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ ہاروت میں اس خوابگاہ کی خاموشی کو حادثہ بنانے کے لئے اپنی قوتوں سے کام لیتا ہوں۔

(زرف کی طرف بڑھتا ہے مگر متوحش واپس آجاتا ہے)

آہ یہ انسان وہی پیکر خاکی ہے جسے کبھی ہم سجدہ کر چکے ہیں، جس کی پیشانی میں انوارِ سرمدی محفوظ ہیں ـــــ جو صبح ازل کی ایک ابدی امانت ہے ـــ انسان! ـــ انسان!!

بندرخت ۔ بدحواس فرشتو، تمہاری لطیف الحِسی اور بیدار نفسی، خیالاتِ مہیب میں محیط ہے اور تمہارے دلوں پر مآل کی تیز روشنی پڑ رہی ہے۔ تم اس تاریک رات کو ہرگز ایک ظالم انسان کے خون سے رنگین نہیں کر سکتے، ادھر آؤ میں تمہیں بیخودی و فراموشی کا ایک ایسا مرکب پلاتی ہوں جس کا ہر قطرہ حلق سے اتر کر ایک جذبۂ انتقام بن جائیگا اور جس کا اثر تمہارے حواس کو انتہائے کار کی خوفناک تکلیف سے بے نیاز کر دیگا۔

"بندرخت ہاروت و ماروت کو شراب پلاتی ہے"۔

ماروت ۔ کچھ نہیں، ہمارے سامنے انسان کی حقیقت کچھ نہیں، ہم اس سے افضل ہیں، قدسی الاصل ہیں

بندرخت ہاں ماءالحیات کا ایک جام ـــــ (بندرخت ایک جام اور پلاتی ہے)

ہاروت ۔ اُفق دور پر ـــ وہ حدّ نظر کے پاس کامیابی کا سورج تھرتھرا رہا ہے، کائنات خاموشی اور ہمت کے ساتھ ہماری جراتِ مردانہ کی تصویر کھینچ رہی ہے ـــ دنیا کی پہلی رات ـــ حسین اور منور بندرخت اُسی کوثرِ ارضی کے چند قطرے اور ـــــ

"بندرخت دوسرا جام ہاروت کو بھی دیتی ہے ہاروت و ماروت آگے بڑھتے ہیں اور زرف کا گلا دبا کر اسکا کام تمام کر دیتے ہیں، یکایک بجلی چمکتی ہے بادل کی ایک پرشور گرج ایوان زرف کو ہلا دیتی ہے ہاروت و ماروت بندرخت کے ساتھ خوابگاہ کی طرف بھاگتے ہیں شمعیں خاموش اور تاریکی بہت زیادہ گہری ہو جاتی ہے"۔

دوسرا دور ـــــ گیارہواں منظر

ہنگامہ زارِ عقیدت

(راستہ)

"چند لوگ مختلف لباسوں میں نظر آتے ہیں"۔

ایک ۔ تم آفتاب کی عظمت کو جھٹلانا چاہتے ہو لیکن میں ثابت کروں گا کہ دنیا میں اگر کوئی عظمت

قابلِ پرستش ہے تو وہ صرف عظمتِ آفتاب ہے۔

دوسرا۔ میں کس طرح مان لوں، درختوں کی موجودگی میں سماوی اجرام کو کیونکر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

تیسرا۔ آفتاب کی حرارت درختوں کی روئیدگی کا باعث ہے جب درخت حرارتِ آفتاب کے محتاج ہیں تو کوئی محتاج معبود کس طرح ہوسکتا ہے —؟

چوتھا۔ مگر درخت ہوا اور رفعِ کثافت کا مخصوص ذریعہ ہیں، اگر درخت نہ ہوں، تو دنیا میں سانس لینا دشوار ہوجائے اُن کی طویل شاخیں، بلند تنے، کثیر التعداد پتے، اور پھر ایک صورت مجسّم صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدا کا وجود ہے تو وہ درختوں میں متشکل ہے اس لئے درختوں کی پرستش ہی ہمارے لئے باعث نجات ہے۔

پہلا۔ جب آفتاب اپنے مکمل جلال وجبروت کے ساتھ اُفقِ عالم پر ایک شہنشاہ کی طرح طلوع ہوتا ہے تو دنیا کی تمام تاریکیاں منور ہوجاتی ہیں، اس کی مضبوط اور قوی کرنیں ہر ذرے کو کروٹ بدلوا دیتی ہیں اور کائنات کے کسی گوشے میں بھی تاریکی وظلمت کا وجود باقی نہیں رہتا۔ یہ ظلمت شکن قوت صرف ایک معبود میں ہوسکتی ہے۔

دوسرا۔ لیکن جب آفتاب مائل زوال ہوکر شفقِ مغرب میں کھوجاتا ہے تو فطرت کی ذی روح پرور ہستیاں درختوں پر سجدے کرتی ہیں اور اپنی ملکوتی زبان میں درختوں کی تہلیل وتحمید کے نغمے گاتی ہیں اگر درختوں کی جاذبِ عبدیت شاخیں ناقابلِ پرستش ہوتیں تو دریا اور پہاڑ ان مسجان فطرت کیلئے دنیا میں کم نہ تھے۔

تیسرا۔ جس طرح آفتاب غروب ہوجاتا ہے اسی طرح درخت خشک ہوجاتے ہیں اُن کے برگ وبار ٹوٹکر گر پڑتے ہیں اور ہم انہیں چیر پھاڑ کر اپنی ضروریاتِ زندگی میں فنا کردیتے ہیں، ایک ایسی فانی مخلوق جس پر ہم قابو یاب ہیں سزاوار معبودیت نہیں ہوسکتی۔

چوتھا۔ اگر آفتاب یزدانی قوتوں کا حامل ہے تو اسے ابر اُسے کیوں چھپا لیتا ہے؟

پہلا۔ حجاب عارضی سے آفتاب کی قوت جلال میں کوئی فرق نہیں آسکتا وہ تو رات کو بھی اپنے پرستاروں کو امن وسکون دینے کے لئے اور اُن کے اشغال عیش ونشاط سے چشم پوشی کرنے کے لئے اپنے عرش میں ساکن ہوجاتا ہے اور پھر اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ جب اور جس وقت چاہے طلوع ہوکر دنیا میں صبح نما دے اور فرائض زندگی کی طرف لوگوں کو متوجہ کردے۔

دوسرا۔ اگر درخت قابلِ پرستش نہیں ہیں تو یہ عظیم الشان پہاڑ جو ایک آلہانہ سکوت لئے ہوئے

اپنی سطوت کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان کی سجدہ گاہ عبودیت کے لئے سب سے افضل و برتر ہیں۔
مگر آفتاب کسی طرح قابل عبادت نہیں ہے۔

(ایک مبلّغ آتا ہے)

مبلّغ۔ دنیا کے ناواقفِ حقیقت انسانو! تم کس بحث میں اُلجھ رہے ہو۔

تیسرا ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں آفتاب قابل پرستش ہے اور یہ کہتے ہیں درخت قابل پرستاری ہیں، کیا آپ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟

مبلّغ درخت، پتھر، پہاڑ، دریا، سورج، چاند، تارے، اور آسمان اور جو کچھ بھی تم زمین پر دیکھ سکتے ہو یا محسوس کر سکتے ہو ان میں سے کسی کو قوتِ یزدانی حاصل نہیں ہے۔

چوتھا۔ تو پھر ہم آپ کو پوجیں، یا انھیں —؟

مبلّغ نہیں، معبود اور خالق صرف وہ ہے جس نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں، اور جو خود کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے۔

پہلا وہ کہاں ہے ہمیں تو نظر نہیں آتا۔

مبلّغ۔ وہ محسوسات اور ادراکات سے بالاتر ہے تمام آسمانوں سے بلند اس کا عرش ہے جہاں وہ اپنی اُلوہیت کی تمام ترشانوں کے ساتھ متجلّی ہے۔

دوسرا۔ اب بھی یہ مسئلہ ذہن نشین نہیں ہوا۔

مبلّغ۔ اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ کوئی فانی چیز خدا نہیں ہوسکتی سورج طلوع ہو کر غروب ہو جاتا ہے اس طرح چاند بھی، درخت خشک ہو جاتے ہیں، آگ بجھ جاتی ہے، چشمے سُوکھ جاتے ہیں، پہاڑوں کا تجزیہ ہو جاتا ہے، پتھر ٹوٹ جاتے ہیں، اس کے علاوہ کسی میں کوئی قدرت بھی فی نفسہ نہیں ہے اُن کے اوصاف اور قوتیں فطری ہیں، وہ سب انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، کہ انسان اُن سے اکتسابِ حیات کرے اور انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اس خدا کو پوجے جو تمام کائنات کا خالق ہے!

تیسرا۔ ہم حدودِ مشاہدہ سے گزر کر واہمہ اور ظنیات کی دنیا میں کھونا نہیں چاہتے ہمارا معبود آفتاب ہے جو اس وقت بھی اپنی تیز نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور اپنی سنہری کرنوں سے ہمیں اشارہ کر رہا ہے کہ ہم اُس کی طرف رجوع ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

چوتھا۔ جب ظنیات پر ایمان لانا قابلِ عمل ہے تو ہمیں انھیں درختوں کی پرستش کرنی چاہیئے۔ جو ہمیں

سایہ میوے پھل پھول لکڑی اور ہوا بخشتے ہیں جس پر ہماری زندگی کا قیام ہے ہم ان کے سوا
کسی کو اپنا معبود حقیقی نہیں سمجھ سکتے۔

(جاتا ہے)

پہلا۔ اگر ہمارے معبود خدا پر کوئی اور قوت غالب ہوتی تو اس کے طلوع و غروب میں ضرور انقلاب پیدا
ہوسکتا تھا مگر وہ غیر منقلب ہے اس لئے وہ ہی ہمارا خدا ہے ہم اور کسی کے سامنے عبودیت کے
گیت نہیں گا سکتے۔ (جاتا ہے)

دوسرا۔ ہمارا خدا (درخت) تمام دنیا میں کثرت کے ساتھ چھایا ہوا ہے ہمیں اپنے معبود میں اطمینان کی
ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور ہمارے سجدے طیور و وحوش کی طرح اسی کے لئے وقف ہیں۔

(جاتا ہے)

مبلغ۔ او خدا رحم رحم تیری مخلوق تجھے نہیں سمجھ سکتی تو خود کسی گوشۂ جہل سے متجلی ہوکر اپنی الوہیت
کا ثبوت دے ورنہ دنیا ظلمت وجہل کی گہرائیوں میں گر کر فنا ہوجائیگی۔ اپنے آثار میں نمودار ہو۔
اور انسان کو اپنی قدرت وعظمت کے انوار سے لبریز ادراک کردے۔ (جاتا ہے)

دوسرا دور ——— بارہواں منظر

خلوت گاہ بندرخت

"ہاروت و ماروت انتہائے ناتوانی و بربادی کے عالم
میں نظر آتے ہیں"۔

ہاروت۔ نفس کی لذتوں کی ناقابل انکار کیفیتیں، انسانی دنیا کی قابل قدر مسرات حیات، آج معلوم ہوا کہ
انسان کی تخلیق کا سبب کیا ہے اور وہ فرشتوں کی دنیا سے علحدہ کرکے عالم اسباب کی رنگینیوں
میں کیوں سانس لے رہا ہے۔

ماروت۔ تقدس ملکوتی کی تمام عظمتیں اس ایک لذت بے نام پر نثار، جو حاصل ہونے کے بعد بار بار
حاصل ہوسکتی ہے، اور جس کا اثر قلب میں ایک نئی روحانیت کا اضافہ کرتا ہے، دنیا کا یہ راز
اگر تمام فرشتوں کو کسی طرح معلوم ہوسکے تو ہماری طرح سب دنیا میں آنے کے لئے آمادہ و مستعد
ہوجائیں اور عالم ملکوت ایک کرۂ ویران کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر آباد ہوکر رہ جائے۔

ہاروت۔ اے مرجع لذات عورت، خلوت کی کیفیات خاموش میں پھر جان ڈال دے۔ چل اور ہمارے

ذوق ناکمل کو دھندلا ہونے سے پہلے پھر ترو تازہ کردے۔

بندرخت۔ میں خدا کے پاک فرشتوں کی خدمت کے لئے وقف ہوں مگر مجھے اس وقت امتحان لیگا نگت مقصود ہے

ماروت۔ ایک نہیں ہزار امتحان دینے کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں اگر تو خوش ہو تو تمام عالم میں تیرے خدا ہونے کی تبلیغ اسی لمحہ سے شروع ہوجائے، اے عورت، خدا آسمانوں پر حکمراں ہے تو زمین پر حکمرانی کر۔

بندرخت۔ مجھے خدائی کی ابھی ضرورت نہیں مگر میں عالمِ ملکوتی کی ہمسیر کرنا چاہتی ہوں اور تمہیں وہ عمل یاد ہے جس کے ذریعہ تم روز آسمانوں پر جاتے ہو اگر تمہیں میرے التفات پر قابو حاصل کرنا ہے تو وہ عمل مجھے اس وقت بتادو۔ میرے دراز پر فرشتو۔

ہاروت۔ ماروت، بتادو تمام اسرار فاش کردو، کونین میں اگر کوئی چیز راز بتائے جانے کے قابل ہے تو وہ "عورت" ہے اور صرف "عورت"

ماروت۔ بیشک عورت ایک راز ہے، آشکارہ ایک بھید ہے کھلا ہوا، اور ایک سرِّ محجوب ہے جو سب کی نگاہ میں ہے مگر کوئی اُسے سمجھ نہیں سکتا۔

بندرخت۔ تو پھر تلقین عمل میں دیر نہ کیجئے تاکہ میں آپ کی نوازش میں تاخیر نہ ہونے دوں۔

ماروت۔ سنو، وہ عمل یہ ہے، (کچھ کان میں کہتا ہے)

بندرخت۔ آپ غلط تو نہیں کہتے ———؟

ہاروت۔ جب چاہو امتحان کرلینا۔

"بندرخت فوراً وہ عمل پڑھتی ہے اُس کا جسم ایک بڑا سیارہ بن جاتا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کی طرف صعود کر جاتا ہے فرشتے نگاہوں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ یکایک ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ خلو نگاہ غائب ہوجاتی ہے زمین کا کچھ حصہ کنوئیں کی صورت میں دھسک جاتا ہے اور فرشتے پابہ زنجیر اُس میں اُلٹے لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں"۔

"فطرت کی آواز گونجتی ہے"۔

فطرت کی آواز۔ گنہگار فرشو۔ دعویٰ اصلاح انسانیت کا انجام دیکھو۔ "تہذیب تخریب کا آل بھی تخریب ہے" جس گناہ کے تم مرتکب ہوئے اُس گناہ کی سزا یہ ہے کہ مناصب ملکوتی تم سے چھین لئے گئے تم قیامت تک عذاب الیم میں گرفتار رہو گے لیکن یہی گناہ انسان سے دنیا میں روز سرزد ہوتے ہیں اور اُن سے مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی سرگزشت ہی گناہ ہے اور اُس کی کافی تلافی صرف یہ ہے۔ کہ وہ گناہ کرنے کے بعد ہماری الوہیت کا قائل و معترف رہے۔

فکر تبسم

گو تبسم آشنائے رنگ و بو گلشن میں تھا — فکر فردا سے،، مگر خارِ خزاں دامن میں تھا

زر بہ دامن پھول ہر اک دامن گلشن میں تھا — عالمِ رنگین یہ احسانِ نمو ساون میں تھا

ہوں قفس میں آشیاں سے دور اور گلشن سے دور — یاد ہے اتنا کہ میرا آشیاں گلشن میں تھا

خاک ہو کر رہ گیا پروانۂ سوز آشنا — اس سے پہلے یہ پتنگا خانۂ روشن میں تھا

چرخ والے شامِ غم آمادۂ لبیک تھے — کس بلا کا درد میرے نالہ و شیون میں تھا

دل پرستارِ وفا ہو کر ہوا آخر ہلاک — فطرتاً کچھ تیرا پیکان کامل اپنے فن میں تھا

جنگلوں میں ڈھونڈنے والے تجھے ڈھونڈا کئے — تو دمِ تفتیش عالم حلقۂ دشمن میں تھا

قیس کتنی منزلیں طے کر کے پہنچا حشر تک — جیتے جی صحرا میں تھا،، بعد فنا مدفن میں تھا

اب کہاں ہے سچ بتا اے حسن برہم سچ بتا — اک زمانہ ہو گیا تو وادیٔ ایمن میں تھا

ہو گیا پیوست دل میں تیر سینہ چھید کر — کس بلا کا زور یارب دست تیر افگن میں تھا

کھل کے غنچوں نے تبسم کر دیا وہ راز فاش — ایک مدت سے نہفتہ جو لبِ سوسن میں تھا

حامد رضا خاں تبسم

فرشتے کی سیر

(اثرِ مصورِ فطرت مولانا شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی)

(۱)

اک پاک فرشتے نے آکر در کھولا ہے اک تارے کا
مشتاق تھا جو اک مدت سے اس دنیا کے نظارے کا

پہلے تو اُسے کچھ دھندلا سا اک داغ دکھائی دیتا ہے
پھر موجِ ہوا میں ہلکا سا اک شور سنائی دیتا ہے

اوّل تو سیہ دھبوں کی طرح میدان نظر آتے ہیں اُسے
جب خوب نظر جم جاتی ہے انسان نظر آتے ہیں اُسے

(۲)

دکھیا دیکھتا ہے وہ دنیا میں نفرت کا نشاں لہراتا ہے
انسان کا انسان دشمن ہے، ایک ایک کو کھائے جاتا ہے

انسان یہ کیسی ہستی ہے کیا کرتا ہے، کیا کہتا ہے؟
اُس تارے سے ہی ناواقف حسرت تارے میں رہتا ہے

سنجیدہ و تیرہ افراد میں بھی انداز ہیں یا اوباشوں کے
اک وجد ہے فانی انسانوں کو ملتے ہیں تڑپ ناشونکے

دنیا میں طرب کی تدبیریں کیا خوب نکالی جاتی ہیں
فولاد گلایا جاتا ہے تلواریں ڈھالی جاتی ہیں

قوموں پہ تباہی لانے کو شاہوں کے خزانے کھلتے ہیں
وعظ امن و اماں کا دینے کو توپوں کے دہانے کھلتے ہیں

بیگانہ ہے نسلِ انسانی کونین کی دل آویزی سے
پیکار میں جانیں الجھی ہیں وابستہ ہیں دل خونریزی سے

فاتح کو تبسم آتا ہے جب پسپا قومیں روتی ہیں
ایوانِ طرب کی قبروں پر بنیادیں قائم ہوتی ہیں

معصوم فرشتہ روتا ہے تقدیر پر ان نادانوں کی
تاریک نظر آتی ہے اُسے گردوں سے جبیں انسانوں کی

(۳)

لازم ہے کہ نسلِ انسانی کو بیگانۂ ظلم و جور کریں
کس طرح مدد ہو سکتی ہے، اس بات پر آؤ غور کریں

(۴)

اک امر ہے لیکن بحث طلب اے نوعِ بشر کے چارہ گرو
فطرت ہی میں ہے خود اسکا جواب آئینِ جہاں پر غور کرو

عیبوں پہ فرشتے کی تھی نظر وہ عیب سے باہر جا نہ سکا
تھی معترضانہ اسکی روش، خوبی کا خزانہ پا نہ سکا

قانون ہے یہ اس دنیا کا جو ڈھونڈو گے وہ پاؤ گے
گرنے کا تصور کرتے ہو ہر گام پہ ٹھوکر کھاؤ گے

(۵)

دیکھو وہ فرشتے نے اک تحقیق کی دل میں ٹھانی ہے
اب منظرِ ہستی روشن ہے اب اس کی نظر نورانی ہے

اس مرتبہ وہ کیا دیکھتا ہے ہر ذرۂ عالم تاباں ہے
موتی کی طرح ہر آنسو میں اک روحِ تبسم غلطاں ہے

اس جنگ جدال کے حیلے سے بنیاد ہے تعمیر ملنے کو
پژمردہ دلی کے سینے میں بیچین ہیں غنچے کھلنے کو

جتنے ہی عداوت کے سورج شدت سے چمکتے جاتے ہیں
اتنے ہی محبت کے ذرّے تیزی سے سمٹتے آتے ہیں

جتنی ہی یہ دنیا اپنی برائی حد سے بڑھاتی جاتی ہے
اتنی ہی حدودِ نیکی سے نزدیک تر آتی جاتی ہے

ہر نقص کی بزمِ ظلمت میں تکمیل کا شعلہ لرزاں ہے
ہر موج تباہی کے اندر جبروتِ حیاتِ انساں ہے

عبرت کی اندھیری راتوں سے چھپتی ہے ضیا انسانوں میں
فطرت کا نظامِ تعمیری ہے گرمِ عمل طوفانوں میں

ذرّے ہوں کہ تارے ضوافشاں گل ہوں کہ شگوفے نورانی
ہر چیز میں ہے سرگرمِ تپش خورشیدِ عروجِ انسانی

ہر حلقہ اپنی خدمت پر مامور ہے زلفِ برہم میں
ہر ذرۂ خاکی رکھتا ہے اک خاص مقام اس عالم میں

ہستی کے حوادث رہبر ہیں آزادِ منش گمراہوں کے
دنیا کے حوادث پردے ہیں فطرت کے تماشا گاہوں کے

سرگرم ہے روحِ جنگ و جدل تعمیر کے معطل کرنے میں
مصروف ہیں سارے نقص یہاں انساں کو مکمل کرنے میں

دھن سادگیِ امروز کو ہے گلکاریِ فردا بننے کی
زہراب کے دل میں کھولن ہے تریاق کا دریا بننے کی

کہتا ہے زمانے کو جو برا ہمدرد نہیں ہے ظالم ہے
وہ اصل میں روحِ عالم کی ہمّت شکنی کا مجرم ہے

(۶)

اس قہر و غضب کی دنیا میں اک دور وہ آنیوالا ہے
انسان پر امن و آسایش کا بادل چھانیوالا ہے

سانچے میں مثالِ شفقت اب خنجر ڈھلنے والے ہیں
لوہے کی نلیوں سے چاندنی کے فوارے چلنے والے ہیں

افلاک سے جنگی طیارے غاروں میں اترتے آتے ہیں
پستی کے دھوئیں سے چمکیلے مینار ابھرتے آتے ہیں

رہ جائینگے ظلم و وحشت کے افکار فقط افسانوں میں
تلواریں بھی جائینگی پڑھول عجائب خانوں میں

مٹ جائینگے نقشے ظلمت کے آثار ضیا رہ جائینگے
قلعوں کے یہ گنبد سر بہ فلک آنسو کی طرح بہ جائینگے

"المختصر" ان ہنگاموں کو جب خوب فرشتہ دیکھ چکا
پرواز کو بازو پھیلائے اور بامِ فلک سے دی یہ صدا

نیکی پہ نہ جا کر ختم ہو جو اِس ایک ہی ایسا کام نہیں
نیکی ہے نیکی سب نیکی دنیا میں بدی کا نام نہیں

آوازیں آرہی ہیں

(حضرت خواجہ حسن نظامی کے قلم سے)

(۴)

میں نبی نہیں ہوں جو آسمان کی آوازیں سنوں۔ میں ولی نہیں ہوں جو الہام کی صدائیں مجھ تک آئیں۔ سائینس داں نہیں ہوں جو آلاتِ جدید چھوٹی صورتوں کو بڑا اور باریک آوازوں کو بلند کرکے مجھ تک پہنچائیں۔

میں تو تصور کا آدمی ہوں۔ میرا تصور جب قائم ہوتا ہے شجر و حجر جمادات و نباتات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ہستی کی آوازیں سنتا ہوں کہ وہ سب اسیری وجود سے نالاں ہیں۔

حیوانات کی صدائیں بھی یہی کہتی ہیں۔ ذرہ کی برابر جانور۔ اور وہ جراثیم جو نظر نہیں آتے کبھی تو جامِ حیات کی نشہ میں کچھ گاتے ہیں گنگناتے ہیں اور میں ان پر وجد کرتا ہوں اور کبھی روتے ہیں غل مچاتے ہیں کہ ہستی کا قید خانہ کب ٹوٹے گا۔

اگر کوئی آلہ اُن کی صدائیں بلند کرنے کا ہوتا تو سب سُن لیتے جو میں سنتا ہوں۔ سب یقین کرلیتے جس کا مجھے یقین ہے۔ سب مان لیتے جس کو میں مانتا ہوں۔

نامعلوم کیڑے جو خوردبین کو پانی میں دکھائی دیتے ہیں میں اُن کی آوازیں ان کو حلق میں ڈالنے کے وقت تصور کے کان سے سنتا ہوں کہ وہ خوشیاں کرتے ہوئے مرتے جاتے ہیں کہ قیدِ زیست سے رہائی کا وقت آگیا۔

کوئی کہتا ہے جیو کی اکھشا کرو۔ مگر جیو کہتے ہیں ہمیں اس جیل خانہ سے چھڑاؤ۔ یہ آوازیں ہر تصور سن سکتا ہے۔ اگر وہ تصور ہو۔ اور ہر آدمی تصور کرسکتا ہے اگر وہ آدمی ہو۔ اور ہر شخص آدمی بن سکتا ہے اگر وہ حقیقت کو شناخت کرنے کی سعی کرے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(پچاس سال کے بعد)

(ایک تخیلی مکالمہ)

رفیع نے شلوار بدلتے ہوئے اور انگریزی ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے قطعاً انگریزی میں کہا "جمیل میں نے آج ایک بڑی پرانی کتاب دیکھی جو ۱۹۲۵ء میں کسی نے لکھی تھی۔ ہندوستانی معاشرت اب سے پچاس برس پہلے کس قدر مضحک تھی۔

جمیل۔ لیکن، تم نے کیا دیکھا؟

رفیع۔ پہلے شلوار اور معمولی پاجاموں پر ترکی ٹوپی پہنی جاتی تھی۔ (ہنستا ہے)

جمیل۔ (قہقہہ لگاکر) بات یہ ہے کہ اسوقت یورپ کے اکثر فیشن ہندوستان میں غیر مقبول بلکہ معیوب تھے، مذہبیت کا عنصر ہر جگہ غالب تھا۔ جسنے اوسوقت کے مسلمانوں کو ترقی اور منزل رسی سے روکدیا تھا۔

رفیع۔ علیگڈھ کے بانی کالج کا یہی مشن تھا۔

جمیل۔ اوہ! بعض بڑی باتیں چھوٹے لوگوں سے شروع ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس سے اُن کی عظمت نہیں بڑھ جاتی۔ جہاز کا موجد ایک معمولی لوہار تھا۔ اسی طرح بہت سی تعجب خیز مشینوں اور صنعتوں کے موجد معمولی افراد تھے۔ لیکن اب ترقی کے زمانہ میں کوئی انکا نام بھی نہیں لیتا۔

رفیع۔ بے شک! مجھے بڑی ہنسی آتی ہے، جب میں سنتا ہوں کہ لوگ ریلوں میں سفر کرتے تھے۔ مدراس کراچی، بمبئی اور کلکتہ جانے کے لئے دو دو تین تین دن صرف ہوجاتے تھے۔

جمیل۔ جی ہاں، سنا ہے ریلیں بالکل جیل کی گاڑیوں سے مشابہ ہوتی تھیں۔

رفیع۔ یہ سب کچھ تھا، مگر انگلستان کی کمپنیوں نے اس زمانہ میں ہندوستانیوں کو بیوقوف بناکر روپیہ خوب پیدا کر لیا۔ جسکی وجہ سے انگلش گورنمنٹ ایک عرصۂ دراز تک ہندوستان پر حکمرانی کرسکی۔

جمیل۔ یہ سچ ہے، ہندوستانیوں کو ہوش تو اب آیا ہے۔ سنا ہے ہماری یونیورسٹی میں تفسیر اور حدیث اور قرآن سب کچھ پڑھایا جاتا تھا۔

رفیع۔ محض اس لئے کہ مسلمان یونیورسٹی کی طرف متوجہ رہیں، ورنہ اس قسم کی تعلیم سے کوئی خاص فائدہ کبھی نہیں

پہنچا ۔ دماغ عقائد کے زہر سے مسموم ہو جاتے ہیں ۔ ذرا کوئی لغزش ہوئی اور "خدا" یاد آیا ۔ یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ لغزش کا سبب کیا ہے ۔ سبب لغزش معلوم کر لیا جاتا تو آیندہ لغزش نہ ہوتی ۔ مگر وہاں تو ہر لغزش ہر حرکت، ہر جنبش، ہر فعل، اور ہر قول آلہی قوتوں کے تحت میں پرورش پاتا تھا ۔

جمیل ۔ یہ کاغذ تمہاری میز پر کیسے ہیں ؟ (پڑھتا ہے) خوب یہ تو صد سالہ جوبلی کا دعوت نامہ ہے ۔

"لارڈ ٹامس لفٹنٹ گورنر"

آپ کو "علیگڈھ یونیورسٹی" کی صد سالہ جوبلی میں طلب فرماتے ہیں ۔ آپ ضرور تشریف لائیں، ورنہ لارڈ موصوف کے لئے سبب رنجیدگی ہوگا

فیس داخلہ ہر اجلاس کے لئے بحساب ؎ فی اجلاس پیشگی بھیجد یجئے ۔

آپکا خادم

ایم ۔ ڈین ۔ چانسلر

پروگرام

۲۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء ۔	صبح ۔ ۸ بجے سے افتتاح ۔	ہارمونیم اور پیانو کے ساتھ ۔
	رات کو ۔ ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک ۔	ڈنر
۲۶ر دسمبر ۱۹۷۵ء ۔	صبح ۔ ۸ بجے سے ۱۰ بجے تک ۔	ٹورنامنیٹ
	رات کو ۔ ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک ۔	ڈبنس
۲۷ر دسمبر ۱۹۷۵ء ۔	صبح ۔ ۱۰ بجے سے ۱۲ بجے تک ۔	آل انڈیا فٹ بال کلب کا اجلاس
	۔ رات کو ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک ۔	سینما

بڑے مزے کی جوبلی ہے ۔ آج ۲۴ر دسمبر ہے، صبح ہوائی جہاز سے چلو ۔ ۸ بجے تک تو پہنچ جائینگے ! ایک ماہ کی طویل تعطیل سے میرا تو جی گھبرا گیا ہے ۔

رفیع ۔ ضرور ۔ تین روز ذرا تفریح رہیگی ۔ مگر تمہیں معلوم ہے اب سے پچاس برس پہلے بھی ایک جوبلی ہوئی تھی ۔

جمیل ۔ اچھا !

رفیع ۔ اُسکا پروگرام پڑھو تو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ ۔ روز ایک علمی جلسہ ۔ روز ایک ادبی مشاعرہ ۔ کبھی ٹیچر کانفرنس ہو رہی ہے ۔ کبھی اُردو کانفرنس ہو رہی ہے ۔ کبھی مسلم لیگ کے جلسے ہیں ۔ کبھی ایجوکیشنل کانفر

اجلاس ہیں ۔ اُس زمانے کے لوگوں کے دماغ کیا تھے غبارے تھے' جنمیں اسقدر پراگندہ خیالات سما جاتے تھے ۔

جمیل ۔ واقعی تعجب کی بات ہے ۔

رفیع ۔ مگر تم تعجب نہ کرو ۔ اسلئے کہ وہ یونیورسٹی کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ پچاس برس میں ایک تعلیم گاہ کیا ترقی کر سکتی ہے ! نہ اردو مکمل تھی نہ انگریزی ۔ تعلیم کی گاڑی ڈھکیل ڈھکیل کر چلائی جاتی تھی ۔ مغربی طنبور جہاں گھرا ہوا اور ہندوستانی اخباروں نے چلانا شروع کیا ۔ وہ تو مغربی تقلید کو کفر سمجھتے تھے ۔ اقبال جوان تھے' اب تو سنا ہے ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھے ہوئے دن رات حقہ پیتے رہتے ہیں ۔ "اسرار بیخودی" اُن پر کھل گئے ہیں اور پیام "مشرق" جو اُنہوں نے مغرب کو بھیجا تھا ۔ قبول ہو چکا ہے ۔ پہلے مشاعرے تبادلۂ خیالات کا بہترین ذریعہ سمجھے جاتے تھے ۔ اب معیوب ہیں ۔ قدیم ہندوستان کے رسم و رواج کے مطابق "کبت" کہنے والوں کی وہ بھی ایک تقلید تھی ۔ بہت پہلے کوئی غالب ہوئے ہیں' جن کی ایک کتاب اردوئے معلّٰی اور ایک دیوان آجکل بھی درجۂ دوئم میں پڑھایا جاتا ہے ۔ پہلے اُن کا کلام میں پڑھایا جاتا تھا ۔ اب تو دنیا بہت آگے نکل آئی ہے ۔ تم نے سنا ہو گا مولانا رشید احمد صدیقی ۸۰ برس کے بزرگ انگریزی میں شعر کہتے ہیں ۔ اور صاحب خوب کہتے ہیں ۔

جمیل ۔ مگر یہ اُس زمانہ میں شاعر نہ تھے ۔

رفیع ۔ نہ ہوں ۔ اب تو شاعر ہیں ۔ مولانا سید سجاد حیدر کے بال سفید ہو گئے ہیں ۔ فرشتوں کی صورت ہے مگر تم نے کبھی اُنہیں اردو شعر پڑھتے بھی سنا ہے ۔

جمیل ۔ نہیں کبھی نہیں ۔ وہ تو انگریزی فلسفہ خوب جانتے ہیں ۔ اور جو کچھ لکھتے ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں ۔

رفیع ۔ اسوقت اخبار وں کے ایڈیٹر ہندوستانی ہوتے تھے ۔ اسلئے انکا کوئی خاص اسکول نہ تھا' اب تو تمام اخبارات انگریزی ہیں ۔ اسلئے نہ ایڈیٹر کانفرنس کی ضرورت ہے نہ اردو کانفرنس کی احتیاج ۔

جمیل ۔ بڑا انقلاب ہو گیا ہے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نفاق کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہر قوم اپنی شخصی خود داری کو قائم رکھنا چاہتی تھی ۔ "علیگڈھ یونیورسٹی" کا نام مسلم یونیورسٹی تھا ۔ اور بنارس یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی تھا ۔ آخر اب یہ دونوں یونیورسٹیاں بھی الہ آباد اور پنجاب کی طرح قومیت کے عنصر سے باہر آگئیں ۔ اور "ہندو" اور "مسلم" کا امتیاز لفظی قائم نہ رہا ۔

رفیع ۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے انقلاب کا ذریعہ ہم پنجابی ہیں ۔ پہلے یوپی والوں کی کثرت اور تہذیب نے مذہبی ہنگامے برپا کر دئے تھے' اب ۸۰ پنجابی علیگڈھ پہنچ گئے ہیں ۔ اور وہ مذہبیت کوسوں دور

چلی گئی ہے۔

جمیل ۔ بے شک، ہم نے علیگڈھ یونیورسٹی کو مطلقاً مغربی قابلیت میں ڈھال لیا ہے۔ مگر اس کام میں ہمیں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی مغربی معاشرت اور مغرب پسندی نے بہت زیادہ مدد دی ہے۔ گو وہ اسوقت یونیورسٹی کے ایک عضوِ کمزور ہیں تاہم اونکی پالیسی جوان ہے۔ اور یونیورسٹی کے ہر شعبے میں کام کر رہی ہے۔

رفیع ۔ جمیل، حقیقت یہ ہے کہ اگر یونیورسٹی میں وہ ہی مذہبی عنصر باقی رہتا تو اسکے تمام کمرے آج ویران پڑے ہوتے۔ اور ہم اہل مغرب کی صحیح تقلید و تائید سے محروم رہ جاتے۔ اب تمہیں بتاؤ آکسفورڈ میں اور ہماری یونیورسٹی میں کیا فرق ہے۔ یقیناً تم کوئی فرق محسوس نہ کر سکو گے۔

جمیل ۔ مجھے یونیورسٹی کے پہلو میں وہ ایک مسجد ابتک کھٹک رہی ہے۔

رفیع ۔ واہ، شاید تمہیں معلوم نہیں، مسجد کا مسئلہ تو حل ہو چکا۔ وہاں ڈننگ روم بنوایا جائیگا۔ جسکے حدود یونیورسٹی میں کہیں جگہ نہیں ہے۔ نماز تو اب ہی وہاں کبھی نہیں ہوتی۔ صرف دوپہر کو چائے وغیرہ پی جاتی ہے۔

جمیل ۔ ہاں تو میں جانتا ہوں۔ نماز پڑھنے کیلئے علیگڈھ کی پرانی جامع مسجد ہی کیا کم ہے۔ جہاں اگلی وضع کے مذہبی دیوانے اب بھی کثرت سے جمع ہو جاتے ہیں۔

رفیع ۔ ہونے دو۔ موجودہ نسلیں عنقریب ان خضر صورت انسانوں سے سبکدوش ہونے والی ہیں۔ تم پچاس برس بعد دیکھو گے کہ ہندوستان اور انگلستان میں کوئی فرق نہ رہیگا۔

جمیل ۔ خیر دیکھا جائیگا۔ اب تو روانگی کی تیاری کرنی چاہیئے۔

رفیع ۔ اچھا۔ گڈ بائی۔ میں صبح ایر اسٹیشن پر ملونگا۔

"فلکی"

مندرجہ بالا مکالمہ جن عبرت انگیز خیالی پیشین گویوں کا حامل ہے خدا نہ کرے کہ وہ پوری ہوں۔ مگر جو کچھ لکھا گیا ہے موجودہ ماحول اور تعمیر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ صرف اسلئے کہ ناخدایانِ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی کو مغربیت کی اس منزل کیطرف نہ جانے دیں جسکی طرف وہ تیزی سے چلی جا رہی ہے اور اپنی قوتوں سے اسمیں ایسی اسلامی روح پیدا کریں جو اپنے لئے غیر ملکی قالب کسی طرح اور کبھی پسند ہی نہ کر سکے۔

ایڈیٹر

اپنے بچّے کی رُوح سے

جو
ہنوز آسمانوں پر ہے

اے اسیرِ ابتدا، اے دور از حدِ نظر
اے کہ تو اب تک ہے اپنی انتہا سے بے خبر

تیرا گہوارہ فقط عزمِ خدا ہے تا ہنوز
تو ازل سے مائلِ نشو و نما ہے تا ہنوز

ہے ابھی ماحول تیرا ایک فردوسی سکوت
سامعہ افروز ہیں نغماتِ حَیٌّ لَا یَمُوتُ

اک دھندلکا ہے ترے چاروں طرف چھایا ہوا
نور کے دریا میں تو پھرتا ہے منڈلایا ہوا

علمِ فطرت میں تحرک کی بھری محفل ہے تو
عالمِ خاموش میں اک نطقِ مستقبل ہے تو

آج تو ہے چرخ پر حور و ملک کا ہم وطن
مجلسِ ارواح ہے تیری حقیقی انجمن!

انقلاب انگیز افتادِ طبیعت ہے تری
اوج سے پستی کی جانب نقل و حرکت ہے تری

ہے فرشتوں کی نظر کی ستی بیدار تو
لغزشِ تخلیق سے گرنے کو ہے تیار تو

تو بہت بے چین سا ہے سبزہ زارِ عرش پر
گر کے سونا چاہتا ہے خارزارِ فرش پر

عازمِ سیرِ فنا ہے تیری فطرت کا زوال
کھینچتا ہے جانبِ ہستی تجھے جذبِ مآل

رُوح کو تخیّل کی بجلی سے کر کے ہمکنار
چاہتا ہوں رازِ ہستی تجھ پہ کر دوں آشکار

رنگ کچھ بگڑا ہوا ہے عالمِ اجسام کا
گوشہ گوشہ ایک محشر ہے غم و آلام کا

اے سکوں پروردہ یکرنگی "دار القرار"
محفلِ صد رنگ ہے یہ ہستیٔ ناپائدار

اس کا ہر ذرہ تمازت سے تپش اندوز ہے
اس کا ہر قطرہ اک آتش خانۂ پرسوز ہے

ہر طرف جنگِ مراسم ہر طرف رزمِ قیود
یا مذاقِ خود پرستی، یا سرِ نام و نمود

رنج و غم ہر جا ضرورت سے سوا موجود ہے
جس کو کہتے ہیں خوشی وہ شے یہاں مفقود ہے

ہے ہر اک حالت کا "قسمت" پر یہاں دارومدار:۔
وہ کتابِ زیست لکھتا ہے جسے پروردگار

تو جب آئے دیکھ کر لانا خطِ تقدیر کو
رُوح کی آنکھوں سے پڑھ لینا ہر اک تحریر کو

دیکھ لینا "علم" اور "اقبال" بھی ہے یا نہیں
یہ نہ ہو تو اعتبارِ راحتِ دُنیا نہیں

علم سے قومیں یہاں پاتی ہیں قوموں پہ عروج — علم پر موقوف ہے ہر سربلندی ہر عروج
علم اور اقبال جسکو مل گیا تقدیر سے — روند ڈالی اسنے دنیا قوتِ تدبیر سے
علم کر دیتا ہے دنیا کے اندھیرے آشکار — علم سے ہوتا ہے قائم زندگی پر اختیار
علم ہے اک زندگی دنیائے حادث کیلئے — علم اک ساحل ہے طوفانِ حوادث کیلئے
علم کیا ہے مشعلِ ظلماتِ محسوسات ہے — علم سورج اور دنیا اک اندھیری رات ہے
علم اگر تقدیر کو تیری نہ دے رنگِ حیات — آنے والے جانبِ ہستی نہ کرنا التفات

عالمِ فانی طلسمِ صد فریب و رنگ ہے — راز اس کا آجتک مہرِ لبِ آہنگ ہے
اس گزرگاہِ فنا کے راستے پیچیدہ ہیں — جس قدر فتنے ہیں سب ہنگامۂ خوابیدہ ہیں
کھیلتی ہے موتِ صبح زندگی کی گود میں — پھول کھلتے ہیں مگر پژمردگی کی گود میں
تنگ ہو جاتے ہیں جب انسان پر ماضی و حال — اپنی غمگینی پہ آتا ہے اسے اک انفعال
پستیٔ تخلیق کی عبرت ستاتی ہے اسے — عالمِ اول کی نزہت یاد آتی ہے اسے
الغرض ہے اک بلا یہ کشمکش زارِ حیات — جس کے طوفانوں سے آخر موت دیتی ہے نجات
موت واپس عالمِ ارواح میں لاتی ہے پھر — جلوۂ بیدار کو اک نیند آجاتی ہے پھر
لوٹتا ہے پھر یہیں واماندۂ سیر و سفر — نفرتیں کرتا ہوا دنیائے ناہنجار پر

یہ عقیدہ ہے مگر انکا جو ہیں گم کردہ راہ — کر دیا ہے جن کو دنیا کی کشاکش نے تباہ
میں نہیں کہتا کہ دنیا مصیبت گاہ ہے — میں نہیں قائل کہ یہ بے چینیوں کی راہ ہے
میں نہیں کہتا کہ ہے یہ صرف مرنیکی جگہ — بلکہ ہے مُردہ جسموں کو زندہ کرنیکی جگہ
اپنی دنیا خود بناتا ہے یہاں ہر آدمی — محبسِ فکر و تردد، مجلسِ عیش و خوشی
جو پتنگے پھیل کر چمکے شرارے بن گئے — جس قدر ذرے ابھر آئے ستارے بن گئے
جذبۂ سعی و ترقی میں توغل چاہیے — آدمی کو فتحمندانہ تحمل چاہیے
جب دماغوں میں مچلتے ہیں خیالات بلند — ایک دن انسان ہو جاتا ہے آخر ارجمند
عالمِ بالا سے پستی کی طرف آنے کے بعد — روح تھک جاتی ہے منزل پر پہنچ جانیکے بعد
جسم جب کرتا نہیں آسودگی کی احتیاط — رفتہ رفتہ روح ہو جاتی ہے صرف انحطاط
پستیٔ فطرت کو ہلکا سا سہارا چاہیے — ہے زمیں بھی آسماں میں یارا چاہیے

یاس اک رخ ہے جمودِ سعی کی تصویر کا
بے کسی اک نام ہے مجبوریِ تدبیر کا

ہے بساطِ آزمائش امتحاں گاہِ جہاں
امتحاں ارواح کی قوت کا ہوتا ہے یہاں

اس کھلے میداں میں ہوتے ہیں جو انساں کامیاب
عالمِ بالا سے ان پر ٹوٹ پڑتا ہے شباب

ان کی نظروں سے سرکتے ہیں حجاب اسرار کے
ان پہ کھل جاتے ہیں جلوے عالمِ انوار کے

زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں وہ مردانِ ہوش
ان کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں ہنگامے خموش

لوٹتے ہیں فتح کر کے کارزارِ کائنات
نام رہ جاتا ہے ان کا یادگارِ کائنات

کاش تو سن لے پیام اے طائرِ بامِ فلک
کاش پہنچیں یہ صدائیں عالمِ ارواح تک

دوارہ[1]

"بڑے دن کی تعطیل میں"

تعارف :-

جو پیٹر، بدقت تمام اپنی ہم مدرسہ لڑکیوں سے رخصت ہو کر ۲۳ دسمبر کی صبح کو کلکتہ سے الہ آباد پہنچی۔ مگر اس کا دل وہاں کہیں لگتا وہ ساحل سمندر کی خوشگوار زندگی بسر کر چکی تھی۔ اُسے خلیج بنگال کی نیم آشوب موجیں بے چین کر رہی تھیں۔ وہ دس مرتبہ گھر سے نکلتی اور پھر گھر جاتی مگر اس کا دل قطعاً نہیں بہلتا تھا۔ وہ تعطیل کے اس کسل آفریں تعطل کو جراحت حیات سمجھتی تھی۔ وہ ایک ایسے حسن سادہ کی مالک تھی۔ جسے مطلق ضرورت آرائش نہ تھی۔ ہمیشہ سپید کپڑے پہنتی تھی اور اس کے گھنے لمبے بال ایڑی پر پڑے رہتے تھے۔ وہ جتنی حسین تھی اُتنی ہی شوخ بھی تھی۔ مدرسہ کی تمام لڑکیوں میں اس کا نام "برق" "Lightning" رکھا گیا تھا۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔ بغیر کتاب دیکھے صرف معلمہ کے بیانات سے سبق یاد کر لیا کرتی تھی۔ اور بعض ایسے اشارات اس کے دماغ میں خود بخود پیدا ہو جاتے تھے کہ معلمہ حیران رہ جاتی تھی۔ وہ مردانہ ہمتوں کی حامل اور حسن پرست جانے والا ایک درد آشنا دل رکھتی تھی۔ مگر اُس کی فطرت میں میلان مطلق نہ تھا۔

اُس کی چار ہم مدرسہ لڑکیاں مدراس میں رہتی تھیں، اور اپنے تجارت پیشہ باپ کی وجہ سے کلکتہ کی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہ بھی بے حد حسین تھیں۔ اتنی حسین کہ مغرب کو اُنہیں اپنی آغوش میں لینے کی تمنا تھی۔ اُن کے صبیح چہرے حدود مدراس کے چار چاند تھے۔ مگر کلکتہ خوش نصیب تھا کہ اِن پانچ سیارگان صبیح کے تنوع جمال سے نور آگین اور ضیا انگیز رہتا تھا۔

کلکتہ گرل اسکول (مدرسۃ البنات) میں پانچ معلمات تھیں جن میں سے دو خالص مغربی

---

[1] دوارہ میری رائے میں سنیما "Cinema" اور بائیسکوپ کا بہترین اصطلاحی ترجمہ ہے۔ جسکے ذریعہ تصاویر متحرک دکھائی جاتی ہیں۔ اسکے لئے ابتک اردو میں کوئی لفظ نہ تھا۔ اور نہ اس نوعیت کے فسانے ابتک اردو میں لکھے جاتے تھے۔ میں بلاخوف مخالفت اسکی ابتدا کرتا ہوں، ترویج و مقبولیت خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ دوارہ کسی انگریزی فسانہ کا ترجمہ یا "سنیما" کا خلاصہ نہیں ہے۔ (ایڈیٹر)

اور تین نیم مغربی نیم ہندوستانی تھیں۔ (X-mas) کی تعطیلات نے ہاوڑہ گھر اسٹیشن کو محشرستان سکوں بنا رکھا ہے اور یہیں سے ہمارا دوارہ شروع ہوتا ہے۔

پہلا منظر

جوپیٹر "دستی" "سامان گیر" لئے ہوئے بھاگی بھاگی آئی، اور جب ریل حرکت میں آچکی تھی وہ درجہ دوم میں بشکل سوار ہوگئی۔ اُس نے دیکھا کہ دو باوضع نوجوان اُسی درجہ میں اور بھی ہیں۔ وہ غیر مانوسانہ انداز سے ایک جانب کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی کہ اُسے بیٹھنے کے لئے کونسی جگہ اختیار کرنی چاہیئے۔ ابھی وہ تمام درجہ کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھی کہ اُن نوجوانوں میں سے ایک، جوپیٹر کی بحیرت نگراں آنکھوں کے معنی سمجھ گیا، وہ ایک اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھا اور جوپیٹر کو اشارہ کیا کہ وہ اس کی جگہ بیٹھ جائے۔ جوپیٹر جو اپنی شوخ ادائی کے لحاظ سے بہت زیادہ بے باک تھی فوراً سر شکریہ کو جنبش دیتی ہوئی اُس کی جگہ جا بیٹھی دُوسرا شخص جو ہنوز سیر اخبار میں کھویا ہوا تھا ہم نشینوں کے اس انقلاب سے چونکا۔ اُس نے ایک نگاہ جوپیٹر پر اور دُوسری اُس شخص پر ڈالی جو سامنے کھڑا ہوا ایک خاص نوعیت سے جوپیٹر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک فربہ اندام شخص تھا جس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ وہ اِن دونوں کی نقل و حرکت کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ اور یہ خیال کرکے کہ شخص ثانی اُس عورت کو چھیڑ رہا ہے اُس سے دست و گریبان ہوگیا۔ نوعیت جنگ پر غور کئے بغیر دونوں دو منٹ تک شریک اورزش رہے اور تیسرے منٹ میں ایک شخص سے درجہ خالی تھا۔

جوپیٹر نے دیکھا کہ جس نوجوان نے اس پر احسان کیا تھا اور اخلاقاً اپنی جگہ اس کو دی تھی وہ ایک فربہی یا آماس کی قوتوں سے چلتی گاڑی سے باہر پھینکدیا گیا ہے، وہ گھبرائی، اُس نے باہر دیکھا اور پھر خطرہ کی زنجیر کھینچ لی۔ گاڑی فوراً ٹھہر گئی۔ جوپیٹر بغیر کسی انتظار کے نیچے کود پڑی۔ بھاگی اور غائب ہوگئی۔ ریل کا محافظ راہ آیا۔ سبب دریافت کیا۔ مگر اب فربہی پھر مصروف اخبار تھی، محافظ چیختا تھا چلاتا تھا مگر کسی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ آخر دو لمحہ رک کر گاڑی پھر روانہ ہوگئی۔

دوسرا منظر

جوپیٹر وہیں پہنچی جہاں وہ نوجوان گرا ہوا تھا۔ اُس نے اُسے اُٹھالیا اور گھبراہٹ کے ساتھ اشارہ کیا کہ دوسری گاڑی آرہی ہے اُس میں چل کر بیٹھو۔ گاڑی اپنی پوری رفتار میں آرہی تھی۔ جوپیٹر یا برق مجسم فوراً سوار ہوگئی۔ اور وہ شخص تھوڑی دور تک لٹکتا رہا آخر بشکل اُسے بھی چڑھالیا گیا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی جوپیٹر اور اُس کا ہمراہی دونوں اُترے۔ موٹر پر سوار ہوئے اور ایک ہوٹل میں پہنچے جہاں

چار لڑکیاں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ (یہ جوپیٹر کی ہم مدرسہ سہیلیاں تھیں) میز پر دلچسپ گفتگو ہوئی۔ جوپیٹر نے نئے مہمان کا تعارف کرایا۔ سب نے ہاتھ ملایا۔ اور کھانے کے لئے میز پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل اجنبی مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے مشاغل تفریح میں مصروف تھے مگر ایک شخص بہت تیز نگاہوں سے ان چھ صورتوں کے مجموعہ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک شریر النفس بدمعاش تھا جس کا تعلق ایک خاص حسن فروش جماعت سے تھا۔ (یہ جماعت "طوفانیہ" کہلاتی تھی۔ اور اس جماعت کے افراد کی خاص نشانی یہ تھی کہ ہر شخص اپنے کالر کے بٹن میں ایک جہاز کی تصویر لگائے رکھتا تھا۔) اس کا نام موریٹس تھا۔ آنکھیں بہت زیادہ روشن اور ابھری ہوئی تھیں۔ وہ دیر تک اس صحبت کو نظروں سے پڑھتا رہا۔ جو اب تک ایک مرمریں میز پر بیٹھی ہوئی مصروف طعام و کلام تھی۔ آخر گفتگو کھانے کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئی۔ پانچ لڑکیاں اور ایک نوجوان ہوٹل سے بل ادا کرنے کے بعد بہ اطمینان روانہ ہوئے موریٹس پہلے تو کھڑا رہا۔ مگر جب وہ پانچوں ذرا دور نکل گئے تو یہ بھی اُن کے پیچھے ہولیا۔

تیسرا منظر

جوپیٹر، اس کا ہمراہی (جس کا نام اب مارشل معلوم ہوچکا ہے) اور چاروں حسین لڑکیاں ایک جہاز میں بیٹھکر رنگون روانہ ہوگئیں۔ موریٹس ان کی نظر سے دُور تمام حرکات و سکنات کا معائنہ کر رہا تھا۔ رات کو ۱۱ بجے جبکہ چاند اپنی کشتی سمندر میں نہایت سکون کے ساتھ لے جا رہا تھا۔ مارشل اور جوپیٹر جہاز کے ایک گوشہ میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اور چاروں جمیل لڑکیاں آپس میں بیٹھی ہوئی مستقبل پر ایک دلچسپ مطالعہ میں مصروف تھیں۔ مارشل جوپیٹر کے حسن معصوم کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور جوپیٹر ایک متین انداز سے مارشل پر تبصرہ کر رہی تھی۔ سمندر کا پر سکون اور خاموش عالم چاندنی کی ٹھنڈی اور نکھری ہوئی روشنی، جہاز کی سبک روانی، چند ایسی حالتیں تھیں جو دو نوجوان دلوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے کافی تھیں مارشل کے ہونٹوں پر تبسم تھا مگر محتاط، جوپیٹر کے لبوں میں شگفتگی تھی مگر غیر محسوس، ہاں چہروں کی حالت سے یہ پتہ ضرور چلتا تھا کہ دونوں پہلوؤں میں دو کنول یا تو رات ہوتے ہی روشن ہوگئے ہیں یا صبح سے پہلے کھلنے پر آمادہ ہیں۔

دفعتاً موریٹس ان کی طرف بڑھا، اور بڑھتا چلا گیا۔ مارشل نے آہٹ محسوس کی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک کریہہ المنظر چیں بر جبیں شخص اس کے برابر کھڑا ہوا شیر کی طرح آنکھیں چمکا رہا ہے۔ مارشل نے سبب مداخلت دریافت کیا جس کا کوئی جواب ایسے لہجہ میں دیا گیا کہ دونوں میں جنگ ہونے لگی۔

جوپیٹر نے ایک لمحہ اس آذیرش کو بہ نگاہ تحیر و بد مزگی دیکھا، پھر بھاگی اور اپنی ہمراہی لڑکیوں کو بلا لائی۔

جب تک یہ وہاں پہنچیں مورلس مارشل کو بہت زیادہ مضمحل اور کمزور کر چکا تھا۔ آخر لڑتے لڑتے یہ دونوں جہاز کے ایک خطرناک کنارہ پر پہنچ گئے۔ جہاں لڑائی کچھ اور تیز ہوگئی اور آخر بے گناہ مارشل تنہا سمندر میں گرا دیا گیا۔
مارشل کمال شناوری سے آشنا تھا، وہ سمندر کی شعاع اور آغوش موجوں کو منتشر کرتا ہوا، اور چاندنی کے طلائے محلول میں غوطے کھاتا ہوا جہاز سے آلگا۔ ایک لمحہ ٹھیرا اور حواس ٹھکانے کر کے جہاز پر چڑھا۔
مورلس فرصت کے ان چند منٹوں میں جوپیٹر کو حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ لڑکیوں نے اُسے بے حد بنایا اور اس کی اس حرکت پر ایک خشم آگین مظاہرہ کرتی رہیں وہ چاہتا تھا جوپیٹر کو بجبر اپنے قبضہ میں لا کر کسی طرف غائب ہو جائے مگر عین اس وقت جبکہ جوپیٹر کی نازک کمر مورلس کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔ مارشل پانی میں بھیگا ہوا بپھرے ہوئے شیر کی طرح اوپر آگیا اور مورلس پر جا پڑا۔ مورلس جو مارشل کے غرق اب ہونے کا یقین کر چکا تھا گھبرا گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ اُس کے حواس جمع ہوں۔ مورلس نے چند بے ترتیب گھونسوں سے اُس کے اطمینان کو پراگندہ کر دیا۔ اور جب وہ ناتوان ہو کر لڑکھڑایا تو ایک سخت دھکا دیکر اُسے سمندر میں ڈھکیل دیا۔

چوتھا منظر

مورلس بری طرح غوطے کھا رہا تھا اور اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پانی کی آسودہ موجوں میں بھی وہ حرکت نہ کر سکا۔ اُسے کوئی صورت ایسی نظر نہ آئی کہ وہ جہاز پر واپس آسکے آخر ایک "برج آبی" جو سطح سمندر پر تیر رہا تھا اُس کے ہاتھ آگیا۔ مارشل اور پانچوں لڑکیاں اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ اور مارشل کا جوش انتقام اسیر نگاہوں کی بجلیاں برابر گرا رہا تھا۔
اب یہ لوگ مطمئن تھے اور مورلس کی واپسی بالکل غیر یقینی ہوگئی تھی کہ جہاز ایک ساحل پر لنگر انداز ہوا سب اترے۔ جوپیٹر اپنی سہیلیوں کے ساتھ مارشل کو لے کر موٹر میں بیٹھی اور چند منٹ بعد یہ لوگ ایک عالیشان عمارت اور سرسبز باغ میں موجود تھے۔ سارو س' ایک ضعیف العمر شخص نے ان لڑکیوں کا پرجوش استقبال کیا جو ان میں سے کسی کا چچا تھا۔ مارشل اور جوپیٹر نے پوری مسرت سے جیج مہمانوں کے ساتھ بڑا دن منایا۔ دوسرے دن ایک بڑی زبردست چائے کی دعوت دی گئی جس میں شہر کی کچھ عورتیں اور کچھ مرد اور بھی شریک تھے۔
جوپیٹر باغ کے فوارے پر کھڑی ہوئی مارشل کے مستقبل کو خیالات تزوج سے زرین بنا رہی تھی۔ مارشل اس سے کچھ دور کھڑا ہوا اُسی عالم خیال میں ہمہ تن مستغرق دیکھ رہا تھا کہ دفعتہ ایک کمند پیچھے سے بڑھی اور مارشل کو ایک بے تاب شکار کی طرح مضبوط گرفت میں لے لیا۔ دو تنومند جوان جھپٹے اور مارشل کو کھینچ کر ایک موٹر پر سوار کر لیا۔ جو باغ کی دیوار کے پیچھے اسی مقصد کے لئے کھڑا ہوا تھا' جوپیٹر نے اس واقعہ کو دیکھ لیا۔ وہ گھبرا کر دوڑی مگر

جب تک وہ دیوار پر چڑھے موٹر جا چکا تھا۔ وہ دوڑ کر اپنے میزبانوں کے پاس آئی اور اس واقعہ کو بیان کیا۔ سب متحیر اور پریشان ہو گئے۔ اور جو پیٹر گھوڑے پر بیٹھ کر مارشل کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔

پانچواں منظر

موٹر چلا جا رہا تھا۔ لمبی سڑکیں اور پر پیچ رستے طے کرتا ہوا وہ ایک غیر آباد مقام پر پہنچا جہاں ایک تنگ کوٹھری میں مارشل قید کر دیا گیا۔ جس کے پیچھے سمندر موجیں لے رہا تھا۔ اور جس کے ایک پہلو میں ایک زبردست چٹان پر ایک گرجا بنا ہوا تھا۔ مارشل رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ اس نے آزاد ہو جانے کی پوری کوشش کی مگر رسیوں کے دو چار بل کھولنے کے علاوہ وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جو پیٹر موٹر کے نشان پر گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی تھی اس کے پیچھے کچھ لوگ اور بھی تھے جو اس کی مدد کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ مورٹس اور اس کا ایک ہمراہی زندانِ مارشل کے باہر اپنی کامیابی پر بیٹھے مسکرا رہے تھے کہ جو پیٹر وہاں پہنچ گئی۔ اس نے بغور دیکھا مگر کوئی اسے نظر نہ آیا۔ اس کی نظر ایک خط پر پڑی جو شاخ درخت میں آویزاں تھا۔ اس نے اسے فوراً کھولا۔ پڑھا تو لکھا تھا۔

"جو پیٹر! میں سخت بلا میں گرفتار ہوں اگر تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو ساحل سمندر پر"
"بنگلہ نمبر ۱۵۳ میں فوراً چلی آؤ۔ میں یہاں گرفتار ہوں۔ تمہارا یہاں آنا قرینِ"
"مصلحت ہو گا۔"

مارشل

جو پیٹر نے یہ خط پڑھا اور پڑھ کر زمین پر پھینک دیا۔ اس کے معاون بھی اس کے پاس پہنچ چکے تھے اس نے اظہار واقعہ کیا اور ساحلِ سمندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جمعیتِ معاون بھی اس کے ساتھ تھی۔

چھٹا منظر

مارشل بدستور گرفتار تھا۔ آخر اس نے اپنی زبردست قوت سے رسیوں کو توڑ ڈالا۔ وہ کوٹھری سے نکلا اور چٹان پر چڑھ گیا۔ مورٹس نے دور سے دیکھا اور اپنے ہمراہی کے ساتھ اس کی طرف بھاگا۔ مگر مارشل نے کود کر سمندر کے آغوش میں پناہ لے لی۔ اور کمالِ شناوری سے زیرِ آب چھپ گیا۔ مورٹس کو اس کی آزادی پر بیحد رنج ہوا مگر وہ مجبور و متاسف تھا۔ فوراً سمندر میں کود پڑا۔ اور جب مارشل ابھرا تو مورٹس اس سے الجھ پڑا۔ سمندر کی سطح میدانِ رزم بن گئی۔ مارشل نے مدافعانہ کوششوں کی انتہا کر دی۔ اور ایک مختصر سی آویزش کے بعد دونوں پردۂ امواج میں پوشیدہ ہو گئے۔

"وقفۂ راحت"

ساتواں منظر

(مورٹس اور مارشل کی بحری جنگ کا اعادہ) مورٹس اور مارشل پردۂ آب میں پوشیدہ ہوگئے اُدھر جو پیٹر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دوسرے ساحل پر پہنچی۔ بنگلہ موجود تھا مگر کوئی شخص اسے وہاں نظر نہ آیا وہ اپنی جماعت کے ساتھ بہت دیر تک اِدھر اُدھر نگراں رہی۔ جماعت منتشر ہو کر کسی متنفس کا پتہ لگانے میں مصروف تھی جو پیٹر ایک چٹان پر کھڑی ہوئی سمندر کی وسیع فضا میں اپنی نظریں پھینک رہی تھی کہ اُسے کسی نے پیچھے سے بزور قابو میں کرلیا۔ اس کا مُنہ بند کردیا گیا اور لوگوں کی نگاہوں سے بچا کر وہ بھی ایک محبس میں بند کردی گئی اس کے ساتھی بہت پریشان تھے۔ مگر یہ سمجھکر کہ ممکن ہے وہ مارشل کی تلاش میں کہیں اور نکل گئی ہو۔ سب نے واپسی کا عزم کرلیا۔

آٹھواں منظر

مارشل سمندر کی ایک سخت آویزش کے بعد اپنے محبس کے کنارے سے نکلا۔ وہ جلدی جلدی اوپر آیا۔ اپنے محبس کے نمبر دیکھے وہ چاہتا تھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر واپس جائے کہ اُس کی نگاہ ایک کاغذ پر پڑی جو زمین پر کھلا ہوا پڑا تھا۔ اس نے کاغذ اٹھالیا۔ پڑھا تو اس میں لکھا تھا۔

"جو پیٹر اب سخت بلا میں گرفتار ہوں اگر تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو ساحل سمندر
"پر بنگلہ نمبر ۵۳ میں فوراً چلی آؤ۔ میں یہاں گرفتار ہوں۔ تمہارا تنہا آنا
"قرینِ مصلحت ہوگا۔

"مارشل"

مارشل اس سازش کا راز سمجھ گیا۔ اُس نے اپنے سر کو ایک حرکتِ انتقام دی اور بنگلہ نمبر ۵۳ کیطرف روانہ ہوگیا۔

نواں منظر

جو پیٹر بدستور قید تھی۔ مورٹس بار بار اس کے پاس آتا تھا اور اُسے اپنی محبت سے مسحور کرنا چاہتا تھا مگر جو پیٹر بدستور مغموم و متفکر تھی۔ وہ مورٹس کو حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اور نہایت خشمناک آواز میں کہتی تھی۔ "تم مجھے رہا کردو میرے مدرسہ کی تعطیل عنقریب ختم ہونے والی ہے" تھوڑی دیر گذری تھی کہ مارشل گھوڑا دوڑاتا ہوا آ پہنچا۔ بنگلہ کے دروازہ پر چار شہزور کھڑے ہوئے تھے۔ وہ مزاحم ہوئے اور مارشل نے چاروں کو اپنے شہزور گھونسوں سے مجروح کردیا۔ اس نے ایک فاتحانہ انداز سے دروازہ پر گھونسا مارا۔ مورٹس عالمِ محبت

وانتقام میں کھویا ہوا تھا اُس نے سمجھا کہ اُس کے ساتھی اسے کسی خطرہ کی اطلاع دے رہے ہیں دروازہ کھولدیا۔ مارشل اندر آیا اور مورِس کو اس بے رحمی سے مضروب ومغلوب کیا کہ وہ بھی بنگلہ سے باہر ایک مجروح شیر کی طرح جا پڑا۔ جوپیٹر مارشل سے لپٹ گئی اور اس سے پہلے کہ دشمن حملے کے لئے سنبھل سکیں دونوں گھوڑوں پر بیٹھکر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

دسواں منظر

جوپیٹر کی ہم مدرسہ لڑکیاں پریشان تھیں، وہ تدابیر پر غور کر رہی تھیں کہ جوپیٹر اور مارشل پہنچ گئے۔ خوشی کے نعرے بلند ہوگئے اور سب نے واپسی کی ٹھیرادی۔ شام کو تفریح کے لئے سب مہمان سمندر گئے۔ جوپیٹر اپنی ہم جلیس لڑکیوں کے ساتھ موجوں سے کھیلی۔ مارشل سے آزادانہ اظہار محبت کیا گیا اور اس خوف سے کہ کہیں مورِس انہیں پھر کسی بلا میں گرفتار نہ کردے۔ اسی دن شام کو سب کلکتہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

گیارہواں منظر

واپسی میں جبکہ جوپیٹر اور مارشل چار لڑکیوں کے ساتھ جہاز پر کھڑے تھے انہیں اپنا بھولا ہوا افسانہ یاد آگیا۔ انہوں نے ہمراہی لڑکیوں سے بیان کیا کہ مورِس نے انہیں جہاز پر کس طرح ستایا تھا۔ اور وہ اسکے دامِ ذیب سے کس طرح بچے تھے۔

(تیسرے اور چوتھے منظر کے بعض حصص کا اعادہ) سب لڑکیاں بے حد ہنسیں۔ امیر البحر نے اُن کے قہقہوں کی آوازیں سنیں اور انہیں عنقریب ساحل پر پہنچنے کی نوید دی۔

مارشل کی تجویز تھی کہ قافلہ کو کلکتہ اترنا چاہیے۔ لیکن جوپیٹر نے کہا ہم ریل سے چلینگے۔ اس لئے ریل کے اسٹیشن پر سب اُتر گئے اور جب ریل آئی تو درجۂ دوم میں سوار ہو گئے۔ اندر آتے ہی انہوں نے دیکھا کہ وہ فربہ اندام شخص جو انہیں جاتے وقت گاڑی میں ملا تھا۔ بدستور اخبار دیکھنے میں مصروف ہے وہ اُسے پہچان گئے۔ یہ مورِس تھا۔ مارشل نے اُسے تند اور تیز نگاہوں سے دیکھا۔ مورِس نے جو ایک شریفانہ لباس پہنے ہوئے متانت کے بہترین عالم میں خاموش بیٹھا تھا ایک بامعنی نظر سے دیکھا اور مسکرا دیا۔

گاڑی اسٹیشن سے قریب تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ جب اسٹیشن ایک میل رہ گیا تو مورِس کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اُسے خیال تھا کہ اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد اس سے مزاحمت کی جائیگی اور وہ پولیس کے سپرد کردیا جائیگا۔ وہ ایک سراسیمگی کے ساتھ گاڑی کے غسل خانہ میں گھس گیا۔ اور جب نکلا تو ایک دلکش عورت کے لباس میں تھا۔ جس میں مردانہ علامت کوئی باقی نہ تھی۔ مارشل اُسے پہچان نہ سکا۔ وہ مبہوت ومتحیر اپنے ہمراہیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسٹیشن آگیا۔ مورِس نے اس تبدیلیٔ لباس سے فائدہ

اُٹھانے کی پوری کوشش کرنی چاہی مگر جوپیٹر کے مشورے سے مارشل نے پولیس کو اطلاع دیدی۔ پولیس نے مورِس کو گرفتار کر لیا۔ اور آخر اس کی وساطت سے بدمعاشوں کی ایک بڑی جماعت کا پتہ چلگیا جو گارڈ یول میں سفر کر کے تنہا جانے والی لڑکیوں کو دامِ فریب میں لاتی تھی۔ اور انہیں فروخت کر دیا کرتی تھی۔

بارہواں منظر

"مدرسۃ البنات" میں تعطیلات کے بعد جب لڑکیوں نے اپنے واقعاتِ تعطیل بیان کئے تو سب میں زیادہ حیرت ناک واقعہ جوپیٹر کا تھا۔ مگر اُس واقعہ کی آخری دلچسپ کڑی یہ تھی کہ مارشل جوپیٹر کا انجان ہمراہی اسی مدرسہ کا پرنسپل نکلا۔ اور یہ راز کھل جانے کے بعد، وہ محبت خوف اور احتیاط سے بدل گئی جو اس دوران میں فی مابین قائم ہو چکی تھی۔

ایڈیٹر

فکاہات

ترا تبسّم شیریں ہے ماہ کی تنویر ۔۔۔ تری لطیف خموشی کنول سے ملتی ہے

زمانہ دیکھ رہا ہے تجھے تعجب سے ۔۔۔ کہ اس طرح کی کلی بھی چمن میں کھلتی ہے

ہاشمی

جامعۂ فطرت

کبھی نظارہ تیرا درس گیرِ صنعِ آذر ہے
کبھی تیری نظر ہم مکتبِ خاقان و سنجر ہے

حسینوں میں کبھی ہے منتشر حسنِ نظر تیرا
کبھی ہے آستانِ دولتِ دنیا پہ سر تیرا

علومِ ظاہری پر رونقیں ہیں تری محفل کی
کبھی منطق کبھی ہے فلسفہ دنیا ترے دل کی

ربابِ نغمۂ و ئے نے جام و مے ہیں مستیاں تیری
صدا اور رنگ پر موقوف ہیں رعنائیاں تیری

یہ اسبابِ تنعم، اور یہ سامانِ عشرت کے
شراب و شاہد و ساقی مصاحب شامِ خلوت کے

در و دیوار پر چسپاں نظر کش چند تصویریں
یہ بے معنی کتابیں، اور یہ بے کار تحریریں

یہ علمِ ہندسہ، یہ فنِ ہیئت، اور نقاشی
یہ ہذیانِ دماغ و ذہن کی ناقص گہر پاشی

غرض الجھا ہوا ہے تو فریبِ خود پرستی میں
ترقی ہے تری تخئیل کی اقصائے پستی میں

بلند اپنی نظر کر، دیکھ عالم بزمِ فطرت کا
تجلی ریز ہے رفعت میں آئینہ حقیقت کا

حدودِ عقل سے باہر نکل اور بے خبر ہو جا
نظر کے ساتھ آزادِ قیودِ بام و در ہو جا

[illegible] حسنِ ظاہر چھوڑ دے تکلیفِ معنی کر
عجب انداز پر ہے محفلِ باطن، تماشا کر

طلوعِ صبح دیتی ہے تجھے کیا درسِ بیداری
سوادِ شام کے لب پر ہے الہامِ فنا جاری

یہ کہسار اور چشمے یہ بیاباں یہ سمن خانے
یہ سورج کی صبوحی، اور یہ تاروں کے پیمانے

نکلنا چاند کا، اور چاندنی راتوں کی نقاشی
کھجوروں کے درختوں سے یہ کرنوں کی ضیا پاشی

یہ پھولوں کا مہکنا، یہ چٹکنا بند کلیوں کا
کہیں نکہت کا بہنا، اور کہیں نغموں کا ہنگامہ

کواکب کے ترنم سے ٹپکنا اشکِ شبنم کا
ثوابت کے تبسم سے لچکنا موجۂ یم کا

درایں اوراقِ فطرت جذب کن ذوقِ تماشا را
وزیں درسِ حقیقت مست فرما چشمِ بینا را

ساغر (نظامی)

پروفیسر محمد اکبر خاں اکبر حیدری

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

پروفیسر اکبر حیدری کا تخیل اس قدر عمیق ہوتا ہے کہ سطحی نگاہیں اُن کے حقیقی مفہوم تک بہت مشکل سے پہنچ سکتی ہیں فرماتے ہیں ؎

میرے حصّے میں جو خیال آیا   اُس میں گویا ترا جمال آیا

پہلے مصرع میں "جو" کی وسعت ایک عجیب ہنگامہ زار خیال پیش نظر کر دیتی ہے۔ لیکن شاعر کا خیال محویت جمال سے اس قدر ہم آغوش ہے کہ وہ جو خیال کرتا ہے جمیل ہو جاتا ہے۔ شاعر کا خیال کبھی غیر جمیل نہیں ہوتا وہ جو کچھ سوچتا ہے اسمیں حُسن ہی حُسن ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس کا فیصلہ یہ کس قدر ناطق ہے کہ تجلِ خیال گویا جمال و جمیل کا ذکر ہے۔ جو حسنِ تخیل میں پیدا ہوتا ہے وہ انہیں جذبات و حسیات کا نتیجہ ہوتا ہے جو محبوب جمیل کی طرف سے دل میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

اب میری عبودیت الفاظ کی منکر ہے ؎ اے اشک سر فگاں آ اور دعا بن جا

عبد اور معبود میں جب تک حجاب ظاہری حائل رہتا ہے دعا اور التجا لفظوں کے لباس میں پنہاں رہتی ہے۔ مگر محویت کبریٰ کی منزل پر پہنچکر مقام عبدیت ختم ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ منزل شروع ہوتی ہے کہ معبود اپنی پوری شانوں کے ساتھ عبد کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ الفاظ زبان پر آنا تو درکنار دماغ میں پیدا ہی نہیں ہوتے اور حسرتیں آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپکنے لگتی ہیں وہی آنسو دعا کے الفاظ ہوتے ہیں۔ جنھیں سننے والا سنتا ہے۔ اور قبول کر لیتا ہے۔

پروفیسر اکبر کے کلام میں "اور وہ" کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ کوئی جب شعر کہتے ہیں تو باعتبار مفہوم اُسے بلند تر کر دیتے ہیں۔ یہ کوشش اکتسابی نہیں کہی جا سکتی۔ بلکہ بعض دماغ قدرتاً اِس طرح وضع کئے جاتے ہیں کہ ان میں اجتہاد کا مادہ فطری ہوتا ہے۔ وہ ایک معمولی بات کو بھی غیر معمولی طریقہ سے ادا کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ مثلاً "ترکِ محبت" کے اقدام کو اکبر اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

پھر ترکِ محبت کا سودا ہے مرے دل میں ؎ پھر ہوش نے لوٹا ہے سرمایۂ بیہوشی

طوفانی موجوں میں نا خدا کی ناکامی اور خدا کا خیال ایک معمولی تخیل ہے، مگر وہ جس انداز سے بیان کرتے ہیں وہ بے حد اثر آفریں ہے ؎

ابھی تو نا خدا کے بعد میرا اک خدا بھی ہے ٭ حوادث کیوں تڑپ کر رہ گئے آغوشِ طوفاں میں

پروفیسر اکبر کی طبیعت میں ایک خداداد ظرافت نظر آتی ہے اور جو لوگ اُن سے مل چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی ہر بات میں ظرافت کی دلچسپی ضرور ہوتی ہے جس سے اُن کی زندہ دلی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن عالمِ شعر میں وہ اس قدر متین اور بلند واقع ہوئے ہیں کہ اُن کے کلام میں کہیں غالب کا فلسفہ اور کہیں مومن کے الہامات جھلکتے ہیں۔ وہ عام شاہراہ سے اس قدر بلند ہو کر شعر کہتے ہیں کہ بعض اوقات اُن کا مقام سمجھنے میں دقت ہو جاتی ہے ؎

المدد اے چشمِ جاناں اے فریبِ ارتباط ٭ اپنے سایہ سے رمیدہ ہوں بخبطِ احتیاط

فریبِ ارتباط ظاہر ہونے کے بعد " بہ خبطِ احتیاط " اپنے سایہ سے رمیدہ ہونا عین ہوشیاری تھا مگر چشمِ جاناں سے مدد مانگنا اس کی دلیل ہے کہ شاعر فریبِ ارتباط میں مبتلا رہنا چاہتا ہے جو صرف چشمِ جاناں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جس میں احتیاط و ہوشیاری مغلوب ہو جاتی ہے ؎

رہنما کی رہنمائی دیکھ لوں ٭ رہزنی اپنی ابھی رہزن نہ چھوڑ

دیکھنے میں ایک بالکل سادہ شعر ہے۔ مگر باعتبارِ مفہوم بے حد بلند ہے۔ ایسے اشعار کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے۔ ابن رشیق بہترین شعر کی تعریف اسطرح کرتا ہے کہ

فَاِذَا قِیلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا
وَاِذَا اُرِیْدَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِینَا

یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔ انتہائے گمراہی کے بعد رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ اگر رہزن کی رہزنی نامکمل ہو تو رہنمائی ہو نہیں سکتی۔ اس لئے شاعر کہتا ہے مجھے اس درجہ گمراہ ہو جانا چاہیئے کہ فطرت خود ایک صحیح راستہ پر لے آئے۔

پروفیسر اکبر کے کلام کو جس قدر امعانِ نظر سے دیکھئے ایک خاص ترفّع محسوس ہوتا ہے۔ اور پھر ایک خاص خوبی جو دوسروں سے انہیں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اُن کے کلام میں حسنِ الفاظ ایک عجیب دلکش موسیقی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اُس کے بغور پڑھنے سے ایک ایسا اثر مترتب ہوتا ہے کہ سامعہ اُس کی لذتوں سے بے ہوش اور حاسہ اس کی کیفیتوں سے مدہوش ہو جاتا ہے۔ ؎

حُسن سے کہہ رہا ہوں دل کے راز ٭ اے محبت گناہ کرتا ہوں

رازِ دل کے اظہار کو بے احتیاطی اور عدمِ مصلحت کی حدوں سے متجاوز کر کے " گناہ " کہہ دینا معمولی بات

نہیں ہے ؎

میری راتیں ہیں کسقدر تاریک ؛ اے تجلی ماہتاب نہ چھیڑ

ایک مہجورِ وصل اور مبتلائے فراق کو چاندنی راتوں میں بھی اپنی تنہائی کی راتیں تاریک نظر آتی ہیں اور وہ شبِ ماہ کی دلکشی و تحریک سے متاثر ہونا نہیں چاہتا۔

اُٹھا لے حسنِ رنگِ گل کا پردہ ؛ نہ کر گمراہ چشمِ دُور بیں کو

شاعر کو پردۂ رنگِ گل میں کچھ اور نظر آتا ہے۔ مگر رنگِ گل کا حُسن دامنِ نگاہ کو اُلجھانا چاہتا ہے وہ مذاقِ تماشا کو اوراقِ گل کے نظارہ میں محدود کرنے پر مُصر ہے کہ شاعر کی دُور بیں نگاہیں کھنچتی ہیں اور وہ "رنگِ گل" کی حدوں سے آگے نکلکر مشاہدہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔ اور خار زار رنگ و بُو میں گمراہ ہونا نہیں چاہتا۔

پروفیسر اکبر کے کلام میں تنوعات کی کثرت، شوکت وتجمل کی فراوانی، اور بلندیٔ تخیل کے وہ بے پناہ نظاہرے ہیں جن کی تنقید وتشریح فی الجملہ ایک مشکل کام ہے۔ جس طرح فنون لطیفہ میں فن مصوری کے محاکات پر تبصرہ مشکل ہے اسی طرح محاکاتِ شعری کی موشگافی آسان نہیں۔

شدتِ دردِ جگر کچھ اور ہے ؛ آج کی شب کی سحر کچھ اور ہے

پہلے مصرع سے غم کی رات کا ایک عجیب پریشان عالم نظر آتا ہے جس میں ایک مہجور دردِ جگر سے بےتاب ہے۔ ایسا درد جس کا درماں نہیں ہوسکتا اور جسکی ہر تڑپ موت کو قریب تر کرتی جاتی ہے۔ یاس اور انجامِ فراق کے اثرات طاری ہیں زندگی کی امیدیں منقطع ہوچکی ہیں۔ دوسرے مصرع میں صبح شبِ فراق کا عبرت انگیز نظارہ ہے۔ "کچھ اور ہے" کہکر شاعر نے تغیر و انقلاب کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی مگر اپنے ہلاکت آفریں مفہوم کو سماعت تک پہنچا دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ پروفیسر اکبر ہندوستان کے ایک ممتاز شاعر ہیں وہ دورِ آخر کے لئے بکثرت سامانِ جراحت مہیا کر رہے ہیں۔ ان کا کلام اس دور کے شاعرانہ محسوسات اور حکیمانہ مطائبات کو آئندہ نسلوں کے لئے شیرازہ بند کر رہا ہے۔ آگے چل کر جب شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا جائیگا تو اکبر کے کلام میں وہ تمام باتیں ملینگی جو ایشیائی شاعری کے لئے مایۂ ناز کہی جاسکتی ہیں اور جن کی موجودگی میں "اردو کا خزانہ" سرمایۂ ادب سے کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔

ایڈیٹر

مشعل صحرا

وہ بجلی جو کل چمکتی تھی طائف کے نخلستانوں میں
وہ درس عمل جو مشکل سے گونجا تھا چند ایوانوں میں

جو علم زبانِ فطرت سے اک امّی کو تفویض ہوا
اے اہلِ محفل تم نے تو وہ عالم بھی دیکھا ہوگا

ادبار کی بدلی چھائی تھی تاریکی آفت لائی تھی
دنیا پہ خموشی طاری تھی بربادی کی تیاری تھی

سب مست نوا ہو کر اٹھے مثل موج کوثر اٹھے
یہ قصر یہ ایواں کچھ بھی نہ تھے سایہ میں کھجوروں کے پہلے

جس نے دیکھا حیراں ہوا نظارہ خود قرباں ہوا
جب علم کا یوں ادراک ہوا دامانِ جہالت چاک ہوا

وہ نسل قدامت دور ہوا پہلو میں دل مسرور ہوا
تحقیق کی جرأت عام ہوئی تمہید سحر شام ہوئی

تعلیم نے وہ عقدے کھولے جو اب سے پہلے کھل نہ سکے!
ہر گام پہ منزل آئی نظر ہر کشتی ساحل پر نکلی

محفل میں ظاہر شمع نہ تھی لیکن نظروں میں جھلک (?) گئی
یہ علم و عمل کی تھی برکت ضو سے بدل ڈالی ظلمت

بیداری کے اک لمحے کی روداد سنیں تو چونک پڑیں
اب جس پر عرشِ رفعت کی بنیادیں جھومی پڑتی ہیں

سنسان فضائے عریاں میں مانگی تھی دعائیں غربت نے (?)
آوارہ وسرگرداں رفتہ نظر محسودِ جہاں آتش بہ جگر

اک لہر بہی اور دوڑ گئی دنیا بھر کے ویرانوں میں
افسانہ بننے والا تھا قومیت کے دیوانوں میں

طوفانِ عمل بنکر نکلا کاشانوں سے میدانوں میں
پروانے ہی پروانے تھے اور شمع نہ تھی پروانوں میں

جو کشتی اب ساحل پر ہے وہ کشتی تھی طوفانوں میں
فطرت نے آخر چھیڑ دیا اک نغمہ سب کے کانوں میں

ہاتھوں سے دل کو تھام لیا اور پھیل گئے میدانوں میں
بزمِ تعلیم ہوئی برپا سنسان کھلے میدانوں میں

گویا یہ بھی آئینے تھے دنیا کی تجلی خانوں میں
کچھ فرق ہوا حیوانوں سے تمیز بڑھی انسانوں میں

رنگین شرابیں ہیں سب نے بھر بھر کے نئے پیمانوں میں
باغوں میں مذاقِ وحشت ملا گلشن نکلے ویرانوں میں

وہ باتیں اب نظروں میں ہیں جو باتیں تھیں افسانوں میں
اک شور امیدوں میں اٹھا اک جوش بڑھا ارمانوں میں

وجدانِ حقیقت کی بجلی جو پنہاں تھی پروانوں میں
افشائے حقیقت عام ہوا ہر ملت کے کاشانوں میں

وہ لوگ جو شب بھر سوئے ہیں راحت کے عشرت خانوں میں
تخئیل کا وہ اک نقطہ تھا موہوم انہیں ویرانوں میں

فطرت کے جوشِ غیرت نے دعوت دی ہے ایوانوں میں
اک دیوانہ ساغر بھی ہے اے علم ترے دیوانوں میں

ساغر

صحافتِ حاضرہ پر ایک نظر

خیابان عرفان | مولوی سید محمد حسن بلگرامی نے فارسی رباعیوں کا یہ نادر مجموعہ مرتب کرکے اپنے مذاق سخن فہمی کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا ہے۔ قریبًا چارسو ہندوستانی اور عجمی شعراء کی منتخب رباعیاں ۳۴ مختلف مگر اہم موضوعات پر اس کتاب میں محفوظ کی گئی ہیں۔ ہر رباعی سے انتخاب کنندہ کی پاکیزگیٔ خیال کا صحیح پتہ چلتا ہے۔ یہ رباعیاں سید صاحب موصوف نے اپنے عمر کے ایک بڑے حصہ میں وقتاً فوقتاً بطور یادداشت جمع کی تھیں اب سب کو بصورت کتاب چھپوا کر اپنی وسیع الاخلاقی اور صحیح المذاقی نیز علم دوستی اور ادبی تبلیغ کے فرض کو پورا کیا ہے۔ فارسی رباعیات کا اتنا بہتر ذخیرہ میری نظر سے آجتک نہیں گزرا۔ ہر صفحہ پر سبز بیلیں "خیابان" کی معنوی وصوری خوبیوں میں ایک اضافۂ شاداب ہیں، کاغذ نہایت دبیز اور سفید ہے، پھر جلد اتنی اچھی بندھوائی گئی ہے کہ بالکل ولایتی معلوم ہوتی ہے۔ جلد پر کتاب کا سنہری نام اور "خیابان فطرت" کا خاموش مرقع بہت زیادہ دلکش اور نظر افروز ہے۔ اندرونی ٹائیٹل کئی رنگوں میں نہایت حسین چھاپا گیا ہے اس کی ایک جلد ہر کتب خانہ اور دارالمطالعہ میں ضرور رہنی چاہیے۔ مجھے امید نہیں کہ اردو پریس ایک ایسا مجموعہ آئندہ بھی جلد پیش کرسکیگا۔ خصوصًا ایسی حالت میں جبکہ ملک کا جذبۂ پندار خودداری بے حد بڑھتا جاتا ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے کمال اور کلام کو اپنے ذریعہ ظاہر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

سید صاحب اردو رباعیات کا بھی ایک ایسا ہی مجموعہ مرتب فرما رہے ہیں۔ خدا انہیں ان مساعی میں کامیاب فرمائے۔

روح تنقید | ہندوستان کی علمی بیداری اور ادبی زندگی اب بہت زیادہ امیدافزا ہے کہ مصنفین اور مؤلفین کو مفید و کار آمد کتابیں لکھنے کی طرف توجہ ہوتی جاتی ہے۔ گزشتہ تیس سال میں غیر مفید اور اخلاق سوز کتابوں کا مواد بہت زیادہ گھٹ گیا ہے۔ اور بیسویں صدی عیسوی میں اردو پریس نے بیشتر کتابیں ایسی شائع کی ہیں جو کسی کے سامنے ہندوستانی "لٹریچر" کی حیثیت سے رکھی جاسکتی ہیں۔

میں نے سینکڑوں حضرات کو یہ کہتے سنا کہ "تنقید بجائے خود ایک فن ہے" مگر "روح تنقید" سے پہلے اس موضوع پر اتنی مکمل اور سیر آب کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ اردو رسائل میں موضوع تنقید پر

اکثر بحثیں ہوئی ہیں لیکن اگر اُن سب کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی نکلیگا کہ تنقید بجائے خود ایک فن ہے جس سے ہندوستانی واقف نہیں"۔ اب اس سوال کا جواب کون دے کہ ہندوستانی جب فنون لطیفہ اور صنائع و بدائع میں اکتساب کمال کا دعوی کرتے ہیں تو فن تنقید سے بے خبر کیوں ہیں؟ عربی، فارسی، انگریزی اور یونانی زبان میں اِس فن کی ایک سے زیادہ کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ مشرقی مصنفین کو غیر ملکی لٹریچر کی تقلید و تمثیل کا شوق ہمیشہ سے ہے مگر کسی نے فن تنقید کو اردو میں منضبط کرنے کی کوشش نہ کی۔ سعی انضباط تو درکنار، خلط بحث سے تنقید کا مفہوم ہی بدل ڈالا"۔ اب تو کسی کتاب کا نام، اسم مصنف، قیمت، حجم، اور ملنے کا پتہ" اجزائے تنقید سمجھے جاتے ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ تنقیص واغماض کا درجہ تنقید کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ "روح تنقید" نے حقیقتاً اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور میں اس کے فاضل مؤلف کو مساعی تالیف کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ بڑا تعجب یہ ہے کہ ہندوستان میں نقاد پیدا ہوئے مگر فن تنقید کو زندہ کرنے والا کوئی پیدا نہ ہوا۔ یا یوں کہئے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

تعارف اور دیباچہ کے بعد یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے (۱) مبادیٔ تنقید اور (۲) ارتقائے تنقید، مبادیٔ تنقید میں تنقید کی تعریف، ادب کی تعریف، ادب کی پیدائش، ادب کی تقسیم، ادب کا مقصد، تنقید کا مقصد، تنقید نگار کے فرائض، تنقید نگار کی نگہداشت، اور اصول تنقید پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں ازمنۂ ماضیہ (یونان) ازمنۂ ماضیہ (روما) ازمنۂ متوسطہ، عصر اصلاح، عصر بیداری اور انکشاف دنیائے جدید، فرانس اور ارتقائے تنقید انگلستان اور ارتقائے تنقید، اٹھارہویں صدی کے تنقید کی ترقی، تین نقاد، مروجہ تنقید، چند تنقیدی کارنامے، مصنفین اور مصنفات کے عنوان سے تنقید کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ روح تنقید من حیث المجموع نفس تنقید کے سمجھنے کے لئے بہترین تالیف ہے۔ "مبادیات تنقید" یعنی روح تنقید کا پہلا حصہ بہت مفید اور کار آمد ہے۔ دوسرا حصہ "ارتقائے تنقید" میں صرف نقادانِ مغرب اور مغربی تنقید کی تاریخ ہے جو باعتبار معلومات ضروری اور اہم معلوم ہوتی ہے نفسیات تنقید پر بحث کرتے ہوئے کہیں کہیں اردو شعراء ادباء کا ذکر بھی آگیا ہے۔ اور اگر خلوص میں مؤلف کا یہ عمل ناقابل معافی ہے کہ ہندوستان کے اکثر قابل ذکر شعراء اور ادیب مجلس تنقید میں شریک نہیں کئے گئے۔ مؤلف کی نگاہ زیادہ تر اپنے ماحول تک پہنچی ہے۔ حالانکہ اُسے وسیع ہونا چاہیئے تھا۔

حروف تہجی کا تصویر دار نقشہ | یہ نقشہ ہمارے کرم فرما مولانا محمد انعام اللہ خاں اور مولانا محمد انتظام اللہ صدیقی گوپاموی نے مرتب کیا ہے۔ جو "دائرۂ معارف قرآنیہ" کے درس کی ایک کڑی ہے۔ اس نقشہ سے نہ صرف

بچوں کو حروف تہجی کی شناخت میں آسانی ہوجاتی ہے بلکہ وہ شوشوں اور حرکات سے بھی بہت جلد واقف ہوسکتے ہیں۔ اسی نقشہ میں عربی حروف تہجی اور اس کے شوشوں اور حرکات کا نقشہ بھی ہے۔ اردو حروف تہجی کو تصویروں کے ذریعہ ذہن نشین کرایا گیا ہے جو بچوں کے لئے درس بھی ہے اور ایک دلچسپ بھی اس نقشہ کے متعلق درسی ہدایات شروع میں باالتفصیل درج کردی گئی ہیں تاکہ بچوں کو سمجھانے میں دقت نہو۔

موصوفین "دائرہ معارف قرآنیہ" کے ذریعہ عالم اسلام کی ایک قابل قدر خدمت کرنا چاہتے ہیں، یہ دائرہ انہیں خطوطِ عمل پر وضع کیا گیا ہے جن پر مسیحی مشن ہندوستان میں کام کر رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تعلیم قرآن سہل الفہم اور عام ہوجائے۔ مسلمانوں کو اس دائرہ کیطرف کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ متوجہ ہونیکی ضرورت ہے۔ ایک اسلامی نصاب بھی تیار ہورہا ہے جسکی فہرست اس نقشہ میں موجود ہے۔ ہر کتاب مستند علماء و فضلاء کی نظر سے گذر چکی ہے۔ اسلئے یقین کامل ہے کہ مسلمان بچے اس نصاب سے اسلام کی سچی تعلیم بہ آسانی حاصل کرسکینگے

سندری سہاگ اور سندری اسنو

سندری سہاگ تیل، اور سندری اسنو، دونوں چیزیں ہمنے خود استعمال کی ہیں تیل تمام جاپانی اور ولایتی تیلوں سے بہتر ہے اور کچھہ ایسی کیمیاوی ترکیبوں سے بنایا گیا ہے کہ سر کو راحت اور دماغ کو فوری فرحت محسوس ہوتی ہے۔ سندری اسنو بھی ہیزلین اسنو اور شملہ اسنو سے کم اثر نہیں ہے۔ اسنو کے استعمال سے چہرہ کی خشکی دور ہوجاتی ہے اور ایک شبنمی بھینی بھینی خوشبو سے شامہ بیدار رہتا ہے۔

کتب منقودہ کے متعلقات تفصیلی

کتاب	مصنف یا مولف	تقطیع	صفحات	قیمت	کتابت طباعت	اشاعت گاہ
خیابان عرفان	مولوی سید محمد حسن بلگرامی	۲۰×۲۶	۵۰۱		اعلیٰ و افسر	مصنف۔ خیریت آباد حیدرآباد دکن
روح تنقید	سید محی الدین قادری زور بی اے	۲۲×۲۹	۲۸۵	۱۲/ عہ	روشن	مصنف۔ نظام منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن
حروف تہجی کا نقشہ	مولوی محمد انعام اللہ خاں مولانا انتظام اللہ الصدیقی	۲۰×۲۶ پورا شیٹ	ایک شیٹ	رنگین ۱/ سادہ ۱/	جلی اور صاف	دائرۂ معارف قرآنیہ آگرہ
سندری سہاگ سندری اسنو				فی شیشی عہ فی شیشی ۱۲/		ایس اے بی بخشی اینڈ کو کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

عروس عالم

ابھی تک تو ہے مصروف طراز شانہ و گیسو * تری تخئیل میں عالم ہے آئینہ پرستی کا

اوٹھا کر مست آنکھوں سے دیکھ اپنا جذب کیفیت * ابھرتا آرہا ہے ذرہ ذرہ بزم ہستی کا

ساغر

دسمبر ۱۹۲۵ء

نسائیات

خلاصۃ الباب:-

گلبدن بیگم

(اثرِ مولوی علم الدین سالک بی۔ اے)

(مسلسل)

بروید۔ تا پانصد از سپاہی و مہتران وہر دو انگہ و کوکہ خود را فرستادند کہ اگر ہمراہ نمی روید تا یک منزل خود بیاید"۔
چنانچہ بیگم کامران کے اصرار سے تنگ آکر ایک منزل تک اسکے ملنے کیلئے آئی۔ مگر کامران نے بیگم کو دیکھ کر پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ اُسنے قسم کھائی کہ میں تمہیں واپس نہ جانے دونگا۔ آخر کار بیگم نے مجبور ہو کر اس مقام کو جہاںپر اُسنے اپنے بچپن کے دن کاٹے تھے خیر باد کہکر لاہور کا رخ کیا۔ بیگم نے یہ واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ ہمایون نامہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتی ہے:۔

"دیگر بنیاد سوگند خوردن کردند کہ من ترا نخواہم گذاشت۔ آخر بعد گریہ وزاری و فغاں از والدۂ ما و والدۂ خود و از ہمشیرہ ہا و از مردم ہر دو برادران کہ از خوردی یک جا کلاں شدہ بودیم و از ہمہ جدا کردہ بہ جبر و زور بردند۔ دیدم کہ فرمان پادشاہی ہم دریں باب است۔ لاعلاج شدم۔ بہ حضرت عرضداشت نوشتم کہ از حضرت چشم داشت آں نداشتم کہ ایں حقیر را از ملازمت خود جدا نمایند و بہ میرزا کامران بخشند آخر در جواب عریضہ حقیر پادشاہ سلام نامہ نوشتہ فرستادند بہ ایں مضمون کہ من دل نداشتم کہ ترا از خود جدا کنم اما چوں میرزا بسیار مبالغہ کرد و عجز و زاری می نمود۔ ضرور شد کہ ترا بہ میرزا سپردم۔ چراکہ الحال ما ہم بر سر ہم آئیم۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہر گاہ کہ ایں مہم صورت پذیرد اول ترا خواہم طلبید۔ (ص ۴۶ و ۴۷)

ہمایون کی قسمت کا ستارۂ اقبال گردش میں آچکا تھا۔ اسکی سپاہ نے جی توڑ کر شیر خاں کا مقابلہ کیا مگر ہر مقام پر اسے سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ ہمایون نے اپنے بھائیوں سے اس معاملہ میں مدد طلب کی۔ مگر سب کی طرف سے اسے کورا جواب موصول ہوا۔ وہ قسمت کی گلہ گذاری کرتا ہوا ایران چلا گیا۔
گلبدن بیگم کچھ عرصہ تو کامران کے پاس لاہور میں مقیم رہی۔ مگر جونہی کہ میرزا کامران کی صحت درست ہوئی وہ اپنے حقیقی بھائی میرزا ہندال کے پاس ملتان میں چلی گئی۔ جہاں پر اسکی والدہ دلدار بیگم بھی مقیم تھی۔ اور جب تیموریوں کی خانماں بربادی کی وجہ سے تمام بیگمات کامران کے پاس کابل پہنچیں تو گلبدن بیگم بھی ان کے ساتھ

کامران نے تمام بیگمات شاہی کو طرح طرح کی اذیتوں سے تنگ کیا۔ چنانچہ اسنے ہر ایک کو الگ الگ کمرہ میں قید کرکے کمرہ کا دروازہ چنوادیا۔ اسکے نوکر مکان کے اوپر سے انہیں کھانا وغیرہ پہنچادیتے تھے۔ مگر گلبدن بیگم اس کے دست تعدی سے پھر بھی بچی رہی۔ کامران اسکی تعظیم کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ نہایت باسلیقہ۔ باتمیز اور خوش مزاج بیگم ہے۔ وہ ذہین ہے اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے تمام بھائی بہنوں سے بہت آگے ہے۔

۹۵۵ھ میں چند سیاسی وجوہات کی بنا پر گلبدن کی شادی خضر خواجہ خاں[1] جسکا سلسلۂ نسب ترکمانوں کے شاہی خاندان سے جاملتا ہے کردی گئی

۹۵۸ھ میں جب کامران کابل چھوڑ کر بھاگ گیا اور ہمایوں قلعہ میں داخل ہوا تو بیگم اسکے سلام کے لئے حاضر ہوئی۔ ہمایوں سے اسے دلی انس تھا۔ اور جہاں کہیں اسکا تذکرہ آتا ہے اسکے قلم سے محبت کا آب حیات ٹپکتا ہے۔ چنانچہ اس ملاقات کا تذکرہ کرتی ہوئی کہتی ہے۔

"در دوازدہم ماہ مذکور (رمضان) حضرت والدہ دلدار بیگم۔ گلچہرہ بیگم۔ و ابں حقیر حضرت راملازمت کردیم۔ چوں مدت پنج سال بود کہ از دولت ملازمت محروم و مہجور بودیم و از محنت دوری و مشقت مہجوری خلاصی شدہ بدولت وصال آسا و نعمت مشرف شدیم برمجرد ایں دل غمزدہ را حضوری و چشم دست دیدہ را نوری تازہ حاصل گذشت و از خوشحالی ہر زماں سجدات شکر بجامی آورد" (صفحہ ۷۶)

ہمایوں کی غفلت سے جب کامران دوبارہ کابل پر قابض ہوا تو اسنے گلبدن کی والدہ کو دیگر بیگمات کے ساتھ سلاح خانہ میں نظر بند کردیا۔ اور گلبدن بیگم سے کہا کہ یہ آپکا گھر ہے۔ آپ غریب خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کریں۔ مگر بیگم نے نہایت جرأت و دلیری سے کہا "جہاں میری والدہ مقیم ہوگی میں تو وہیں رہونگی" ازاں بعد کامران نے بیگم کو مجبور کیا کہ وہ اپنے خاوند خضر خواجہ خاں کو ایک خط کامران کی مدد کیلئے لکھے۔ بیگم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ میں نے اسے کبھی خط نہیں لکھا۔ اور نہ میں لکھونگی۔ کامران نے گو بہت ہی خوشامد کی مگر بیگم نے نہ ماننا تھا نہ مانی۔ ان واقعات کا تذکرہ کرتی ہوئی گلبدن بیگم لکھتی ہے۔

"چوں حضرت بہ نواحی کابل رسیدند۔ میرزا کامران والدہ دلدار از خانہ طلبیدند۔ و حضرت والدہ را حکم کردند کہ درخانہ قوربگی باشند و مرا گفتند کہ ایں ہم خانہ اش است۔ ہمی جا باشید من گفتم برائے چہ اینجا باشم۔ درجائے کہ والدہ من خواہد بود من نیز آنجا خواہم بود۔ ایشاں

---

[1] Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum V. I. page 247.

درجواب من گفتند کہ پس شما بہ حضرت خضر خواجہ خاں خطے نویسید کہ آمدہ بہ ما ملحق شوند و خاطر جمع دارند بنوعیکہ کہ میرزا عسکری و میرزا ہندال برادران من اند ایشاں نیز پہلوے من اند کہ ایں وقت مدد است۔ من جواب ایشاں گفتم کہ خضر خواجہ خاں سواد ندارد کہ خط مرا شناسد و من ہرگز خود نہ نوشتہ ام۔ در بیرون از زبان فرزند انش می نویسند۔ ہرچہ خاطر ش رسد می نویسید۔" (صفحہ ۷۹۔ ۸۰)

ہمایون کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اسنے قنبر بیگ کو خضر خواجہ خاں کی طلبی کیلئے بھیجا۔ ادہر میرزا کامران کو بھی ہمایون کی اس چال کا پتہ چل گیا۔ اسنے اپنے دو نہایت معتبر مشیروں کو خضر خواجہ خاں کی خدمت میں بھیجا۔ خضر خواجہ خاں کامران کی غداریوں سے اچھی طرح واقف تہا۔ اور وہ جانتا تہا کہ کامران کا انجام نہایت عبرتناک ہوگا۔ اسلئے وہ قنبر بیگ کے پہنچتے ہی ہمایون کی خدمت میں حاضر ہولے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ ہماری فاضل بیگم لکہتی ہے:۔

"آخر خضر خواجہ خاں بہ مجرد شنیدن ایں خبر و پیغام فرح انجام متوجہ درگاہ ملک بارگاہ گشت (صفحہ ۸۰)

جب کابل دوبارہ فتح ہوا اور کامران وہانسے بھاگ گیا تو اکثر بیگمات ہمایون کے دیدار کے لیے بیتاب تہیں۔ اور چاہتی تہیں کہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر داستان کلفت سنائیں۔ نیز وہ اپنے جی میں یہ بہی ٹہانے ہوئے تہیں کہ جو کوئی سب سے اول بارگاہ ہمایونی میں داخل ہوگی وہی بادشاہ کی مقرب ہجی جائیگی بیگا بیگم تو بالکل آپے سے باہر ہو رہی تہی۔ گلبدن بیگم نے سب کو سمجہایا اور کہا کہ حضرت بادشاہ ابھی تک مہمات ملکی کے انصرام میں مشغول ہیں۔ جب وہ فارغ ہوجائینگے تو خود ہی سب کو طلب کرینگے۔ بعض بیگمات نے گلبدن بیگم کے اس بیان کو خودغرضی پر محمول کیا۔ مگر انجام وہی ہوا جو گلبدن بیگم نے بیان کیا تہا۔ ہمایون نے عنبر ناظر کو یہ پیغام دیکر بھیجا کہ جب تک ہم نہ آلیں تم سب اپنے اپنے گھروں میں رہو۔ تہوڑا عرصہ نہیں گذرا تہا کہ بادشاہ سلامت تشریف لے آئے۔ سب سے اول وہ اپنی والدہ دلدار بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بعد ازاں گلبدن بیگم سے ملے پھر اسکے بعد بیگا بیگم۔ خجندا بانو بیگم و دیگر بیگمات کو باریابی کا شرف عطا کیا۔ گلبدن بیگم کی شروع سے یہی خواہش تہی کہ چاروں بھائیوں میں اتفاق ہو اور وہ اتحاد کامل کے ساتھ رہیں۔ کدورتیں دور ہوں۔ غلط فہمیاں کافور ہوں اور وہ ایک دوسرے کو جان و دل سے چاہیں۔ مگر اسکی یہ آرزو ابھی تک پوری نہ ہوئی تہی۔ آخر کار جب کامران اور ہمایون کی صلح ہوئی تو ہمایون نے ایک نہایت زبردست دعوت اپنے تمام بھائیوں کو دی۔ جب دستر خوان چنا گیا اور سب کھانے کیلئے اکھٹے ہوئے تو ہمایون نے گلبدن بیگم سے مخاطب ہوکر کہا:۔

"در لاہور گلبدن بیگم گفتہ بودند کہ این آرزو دارم کہ ہمہ برادران رایکجا بہ بینم واز صباح کہ نشستہ ایم ہمہ سخن بہ خاطرم کمی رسید۔ انشاء اللہ تعالیٰ محبت ما راحق سبحانہٗ تعالیٰ در اماں خود دارد۔"

یہ واقعہ ۱۵۴۵ء کے درمیان رونپذیر ہوا۔ اس کے بعد ۶ سال کے عرصہ میں کوئی ایسا اہم واقعہ رونپذیر نہیں ہوا جس میں بیگم نے امتیازی حیثیت سے حصہ لیا ہو۔ ۱۵۵۱ء میں کامران میرزا نے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھکر ہمایون پر شبخون مارا جس میں ہمایون کے بہت سے سردار اور گلبدن بیگم کا حقیقی بھائی ہندال مارا گیا۔ ہندال میرزا سے گلبدن بیگم کو دلی محبت تھی۔ جب وہ اسطرح مارا گیا تو بیگم کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ اس واقعہ کو بیان کرتی ہوئی لکھتی ہے:۔

"نمی دانم کدام ظالم بے رحمے آں جوان کم آزار را بتیغ ظلم بیجان کردہ۔ کاشکے بہ دل و دیدۂ من۔ یا بہ سعادت یادپسر من یا بہ حضرت خواجہ خاں (گلبدن کا شوہر) آں تیغ بے دریغ می رسید۔"

وہ اپنے بھائی کی اس حسرت ناک موت کو یاد کرتی تھی اور زار زار روتی تھی۔ اور باربار یہ شعر پڑھتی تھی:۔

اے دریغا۔ اے دریغا۔ اے دریغ
آفتابم شد نہاں در زیر میغ

بیگم کی بقیہ زندگی نہایت عیش و آرام سے گذری۔ اوس کے اوقات کا بیشتر حصہ یاد الٰہی میں بسر ہوتا تھا۔

۱۵۷۵ء میں وہ عازم حج ہوئی۔ اکبر اسے ایک دم بھی اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بیگم کی اس دیرینہ خواہش کو طرح طرح کے حیلوں حوالوں سے ٹال دینا چاہتا تھا مگر بیگم کے اصرار سے وہ مجبور ہو گیا اور آخر کار اسنے زاد سفر دیکر بہت سی بیگمات کیساتھ اسے رخصت کیا۔ اور شہزادہ مراد کو حکم دیا کہ وہ سورت تک اس قافلہ کو پہنچا آئے۔ علامۂ ابوالفضل سال بستم اکبری کے واقعات بیان کرتا ہوا کہتا ہے:۔

(باقی)

بہار

(۱)

لائی نوید فصلِ گل موجِ نسیمِ مشکبار ؟
ہر پھول سے ہے نزہت نگار
صحنِ چمن ہے غنچہ بار
نرگس کو ہے رنگین خمار
ہیں میکدے جس پر نثار
لائی نوید فصلِ گل موجِ نسیمِ مشکبار

(۲)

ہے بادۂ گلرنگ سے ہر جامِ نرگس سے چھلکاں
ہر پھول ہے اک گلستاں
ہر پنکھڑی عنبر فشاں
ہر نخل ہے قطعہ جواں
مرغِ چمن ہیں نغمہ خواں
ہے بادۂ گلرنگ سے ہر جامِ نرگس سے چھلکاں

(۳)

رنگِ لبِ گل پر ہے اک موجِ تبسم نور پاش
بلبل کا ہوگا راز فاش
غنچوں کا دل ہے پاش پاش
پتوں میں اک ہے ارتعاش
اے عہدِ رنگین شاد باش
رنگِ لبِ گل پر ہے اک موجِ تبسم نور پاش

(۴)

پھولوں کی اُف یہ مستیاں یہ شوخیاں اور یہ ادا
یہ عطر میں ڈوبی ہوا ؛
سبزہ سے ہے کوسوں تک ہرا
چھائی ہے متوالی گھٹا
لبریز نزہت سے ہے فضا
پھولوں کی اُف یہ مستیاں یہ شوخیاں اور یہ ادا

(۵)

ہر چشمۂ کوثر فشاں گویا ہے اک نہرِ شراب
اُف یہ طلسمِ موج و آب
آئینہ پیکر بے حجاب
گل اُس میں تصویرِ شباب
ساغر بکف ہے ہر حباب
ہر چشمۂ کوثر فشاں گویا ہے اک نہرِ شراب

(۶)

اُف! عندلیبِ زار کا یہ نالۂ محشر بدوش
یہ موسم اور معمورِ جوش
گل زر بکف مستی فروش
ہے ہر کلی کیفِ خموش
اور تیتری لذّات نوش
اُف! عندلیبِ زار کا یہ نالۂ محشر بدوش

(۷)

میں اے حیا ہر سانس سے سنتی ہوں پیغامِ بہار
ہوں مستِ الہامِ بہار
دل ہے کہ اک جامِ بہار
ہونٹوں پہ ہے نامِ بہار
آنکھیں ہیں خوش کامِ بہار
میں اے حیا ہر سانس سے سنتی ہوں پیغامِ بہار

خورشید اقبال حیا

ثریا کی کامیابی

ثریا عصمت آرا کی پروردہ نازونعم دوشیزہ، باندازۂ حسن وجمال جاہل تھی، وہ جتنی حسین تھی اتنی ہی بے علم اور آلودۂ جہالت بھی تھی۔ حسن بذاتہ ایک جوہرِ قابل ہے جس سے بہت سے عیوب چھپ جاتے ہیں۔ اسکی جوانی کے ساحرانہ نشہ ونما نے اسے پرسش علم سے بے نیاز کر دیا تھا اچھے اچھے خاندانوں میں اس کی مانگ تھی آخر وہ جمال مرزا کے بڑے لڑکے خورشید جمال کی رفیق زندگی بنائی گئی خورشید ایم۔ اے پاس کر چکا تھا اُسے یقین تھا کہ جو عورت اُسکی زندگی سے وابستہ کیجائیگی وہ ضرور تعلیم یافتہ اور ادب دوست ہوگی مگر شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ جسکے سنہری دامن سے اُسے وابستہ کیا گیا ہے وہ ایک جاہل محض عورت ہے جس نے رسم طفلی کے مطابق "قاعدۂ بغدادی" بھی نہیں دیکھا اور جسے گفتگو کرنے کا اتنا سلیقہ بھی نہیں جتنا کہ محض فیض صحبت سے ایک بازاری عورت کو نصیب ہو سکتا ہے۔

وہ شادی کے بعد کچھ عرصے تک ثریا کے حسن ظاہری سے مسحور رہا مگر جب اُسے معنوی خوبصورتی اُسمیں قطعاً نظر نہ آئی تو وہ اپنے دل میں کبیدہ رہنے لگا خاندانی عظمت اور شخصی قابلیت نے اُسے سرکاری محکمہ میں ایک معزز عہدہ دار بنا دیا اسکی ذاتی وجاہت چندہی روز میں بے انتہا بڑھ گئی مگر جاہل رفیق زندگی کی معیت نے دنیا کو اسکے لئے دوزخ بنا دیا، وہ ہر لمحہ فکرمند رہتا تھا، اُسے دنیا کی کسی چیز میں کوئی لطف نہ تھا جب وہ کچہری سے گھر آتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ جس مجرم کو آج اُسنے ۱۲ گھنٹے کی سزا دی ہے وہ مجرم یقیناً خود ہے۔

(۲)

خورشید نے ایکدن نہایت اثرانداز لہجے میں ثریا سے کہا۔ کاش اس بے پناہ حسن صورت کے ساتھ تم میں علم بھی ہوتا۔

ثریا۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں نہیں پڑھایا، اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔؟

خورشید۔ یہ سچ ہے مگر اب تمہارے ماں باپ کے قصور کو میں ناقابل برداشت سمجھتا ہوں۔

ثریا۔ جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟

خورشید۔ یعنی میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا۔

ثریا۔ ایسا تو نہ کہو میں کہیں کی بھی نہ رہونگی۔

خورشید۔ بے شک تمہاری جہالت کی یہی سزا ہے۔

ثریا۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟

خورشید۔ خیر۔ یہ تو شرافت سے بعید ہے، لیکن میں دوسری شادی ضرور کرونگا۔

ثریا۔ کب تک؟

خورشید۔ بہت جلد، ایک مہینے کے اندر اندر۔

ثریا۔ اتنی جلدی ——— (ثریا بے چین ہوگئی اُسکا دماغ کسی خاص اثر سے تھوڑی دیر کیلئے ماؤف ہوگیا) مگر یہ تو بتاؤ کہ میری ہم عمر عورتوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا کوئی طریقہ ہو بھی سکتا ہے

خورشید۔ اب اس عمر میں تم کیا پڑھو گی پڑھنے لکھنے کیلئے بچپن کا زمانہ ہوتا ہے۔

ثریا۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ بچپن کی پڑھائی یاد نہیں رہتی، اور جوانی کی پڑھائی یاد رہتی ہے۔

خورشید۔ پھر کیا تم اب پڑھنا چاہتی ہو۔

ثریا۔ ہاں خدا کے لئے میرے پڑھنے کا انتظام کردو، میں پڑھوں گی اور بہت جلد پڑھ جاؤنگی۔

خورشید۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ اور نہ میں اپنا وقت برباد کرنا چاہتا ہوں۔

ثریا۔ تمہیں میری قسم ——— اچھے ——— مجھے فقط ایک مہینہ دیدو اگر میں نہ پڑھوں تو پھر تم شوق سے دوسری شادی کرلینا۔

(۳)

سلیمہ خانم ایک معلمہ اور مس شریف ایک یوروپین استانی، ثریا کو روز پڑھانے آتی ہے آج پورا ایک مہینہ گذرچکا ہے خورشید نے اپنا التفات قطعاً کم کردیا ہے اور ثریا دن رات اکتساب علم میں مصروف ہے۔ ایک مہینے کے بعد خورشید کو ثریا کا وعدہ یاد آیا، رات کو اُس نے ثریا سے پوچھا۔ کہو تم نے اپنے لکھنے پڑھنے کے متعلق کیا نتیجہ نکالا۔

ثریا۔ وہی جو خطِ قسمت" میں لکھا ہوا تھا۔

یہ پہلا ترکیبی جملۂ اضافی تھا جو عمر بھر میں آج ایک سال کے بعد ثریا کی زباں سے خورشید کے سامنے نکلا وہ چونکا ایک ناگہانی مسرت نے اُسکی آنکھوں کو زیادہ اُبھار دیا، وہ سنبھلا اور پھر پوچھنے لگا۔ کیا لکھا ہوا تھا؟

ثریا۔ "یہی کہ آپ ترکِ تعلق کی صبر آزما بجلی گرا کر میرے خرمنِ جہالت کو خاکستر بنادیں"۔

خورشید۔ ماشاء اللہ اب تو آپ بہت اچھی اردو بول لیتی ہیں۔

ثریا۔ جی، بھلا بولنا میں کیا جانوں، مگر ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تعلیم یافتہ مردوں کو عورتوں کی ذات سے محبت نہیں ہوتی بلکہ وہ انکی صفات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔

خورشید۔ توکیا یہ آپ کے خیال میں کوئی بری بات ہے۔

ثریا۔ ہرگز نہیں ـــــــ لیکن یہ سوسائٹی کا قصور ہے ایک جاہل لڑکی کے والدین کسی تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنی لڑکی دے کر اسکی عمر برباد کرنا چاہتے ہیں اگر انہیں اپنی لڑکی سے محبت اور اسکے لئے تعلیم یافتہ شوہر کی ضرورت ہے تو انکا فرض ہے کہ وہ اوائل عمر سے لڑکی کی تعلیم کا انتظام اسکے معیار پر کریں اور اگر اس میں ناکام ہوں تو پھر جاہل شوہر کا حاصل کرنا ہی اُن کے لئے قرین مصلحت ہے۔

خورشید۔ یہ صحیح ہے میں بے حد مسرور ہوں کہ آپ نے میری محبت کا احترام کیا اور اس سے پہلے کہ میں آپ کی زندگی غیر خوشگوار بنادوں آپ نے میری زندگی کو خوشگوار ہونے کے قابل بنادیا۔

ثریا۔ میں آپ کے اس خیال کا شکریہ ادا کرتی ہوں غالباً آپ نے پہلا خیال دل سے نکالدیا ہوگا۔

خورشید۔ اسی وقت، جب اس ملاقات میں پہلا جملہ "خط قسمت" آپکی زبان سے نکلا وہ خیال میرے دل سے قطعاً نکل گیا۔

(۴)

اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا، اب ثریا تعلیم یافتہ عورتوں میں ممتاز سمجھی جاتی ہے، اس نے اردو فارسی، عربی اور انگریزی میں ایسی مہارت حاصل کرلی ہے کہ وہ بے حد مشہور ہوگئی ہے۔ اردو رسائل اسکے مضامین بہ منت طلب کرتے ہیں، انگریزی اخبارات میں اسکی تحریریں خاص پایہ اور مخصوص اثر رکھتی ہیں وہ اپنے مضامین مصری اور ایرانی رسائل و اخبار میں بھی بھیجتی ہے، خورشید جمال اپنی بیوی کے اس مبارک انقلاب سے اسقدر مسرور ہیں کہ بڑی بڑی جماعتوں اور مجلسوں میں وہ ثریا کا ذکر کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

"لیڈیز کانفرنس" کی مجلس منتظمہ نے ثریا سے صدارت جلسہ قبول کرنیکی درخواست، اس نے بطیب خاطر منظور کرلیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اجلاس میں پردہ کا خاص انتظام رہے اس نے اراکین مجلس انتظامیہ کو لکھا کہ ۵ برس سے زیادہ عمر کا اگر کوئی بچہ بھی کانفرنس کے پنڈال میں آجائیگا تو وہ فوراً پنڈال چھوڑ دے گی۔ اراکین کانفرنس نے ثریا کی یہ شرط منظور کرلی، اور نہایت سختی کے ساتھ اسکی پابندی کا وعدہ کرلیا۔ ثریا کی صدارت نے ملک میں ایک عجیب خوشگوار اثر پیدا کردیا تعلیم یافتہ اور مہذب عورتوں نے شرکت کانفرنس کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی کہ تاریخ اجلاس سے ۱۵ روز قبل تمام نشستیں محفوظ ہوگئیں اخباروں نے مسز خورشید کا بڑے پُرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا آخر تاریخ اجلاس آگئی۔ ثریا کرسی صدارت پر بیٹھی شرکائے کانفرنس کے حسین تبسم نے اسکا استقبال کیا، ہزاروں محشر ساقامت اسکی تعظیم کیلئے کھڑے ہوگئے، وہ ایک برق مجسم کی طرح کرسی سے اٹھی، اسنے اپنی نگاہوں کی روشنی چاروں طرف پھیلادی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ

وہ سحر تقریر سے پہلے سحر حسن کی قوتیں دکھانا چاہتی ہے' نسائی آنکھیں جن میں شہلائی نرگسی' مخمور' نیمباز مست' فتان' شوخ' آہو فریب' اور سبھی قسم کی تھیں' اُسکی ناطق نگاہوں اور متکلم اداؤں کے سامنے جھکی جاتی تھیں' جب ثریا چند منٹ اپنے تحمل کا مظاہرہ کر چکی تو اُسکے رنگین اور جاذب نظر ہونٹوں میں شگفتِ گل کی طرح ایک حرکت پیدا ہوئی' دو جھومی اور اُس نے کہا:-

بنات الارض!

میں ایک عورت ہوں' جو شادی سے پہلے ۱۵ برس تک جاہل رہی اور شادی کے بعد پانچ برس میں اس قابل ہو گئی کہ "مجلس الخواتین" کی کرسی صدارت نے مجھے قبول کرلیا' شادی نے میری زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا' اور یقیناً شادی سے زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا' جب تک عورت اپنی زندگی ایک واقعی انقلاب سے تغیر اندوز نہ کردے۔

مجھے اپنے حسن پر ناز تھا' اور میں سمجھتی تھی کہ حسین تیروں سے اپنے تعلیم یافتہ شوہر کے قلب کو مجروح کرنے میں کامیاب ہو جاؤنگی' مگر میرا خیال غلط نکلا میرا ترکش خالی اور مجھے اپنا شکار مائل اغماض نظر آیا' وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ میری موجودگی میں اپنے محبت کا مرکز کوئی اور تلاش کریں میں اُن کی اس آمادگی سے لرز گئی' کانپ گئی بے چین ہو گئی اور میں نے سوچا کہ جو تکالیف مجھے اپنے انصاف پسند اور حق بجانب شوہر کے بے تعلق اور غیر ملتفت رہنے میں اُٹھانی پڑینگی وہ ہی تکالیف میں حصول علم میں کیوں نہ اُٹھالوں؟ خدا نے میری مدد کی اور میں اپنی رفیق استانیوں کی مہربانی سے بہت جلد حدود جہالت کو عبور کر گئی' میں آپ کے سامنے یہ بیان کرنا چاہتی ہوں کہ حقیقی زندگی بغیر علم کبھی حاصل نہیں ہو سکتا' میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک عورت تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی اپنی زندگی کی اہمیت کو سمجھ سکتی ہے' جہالت کی تاریک دنیا علم کی روشن اور منور دنیا سے بالکل علٰحدہ ہے جاہل عورتیں کتنا ہی غور کریں اور کتنا ہی سوچیں دنیائے علم کی لذات اور اُس کے ادراکات سے واقف نہیں ہو سکتیں۔ علم ہمارے دماغ کو وہ درخشانی عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں ہم تمام دنیا کی سیر کر سکتے ہیں جاہل عورت کی دنیا محدود اور خاموشی سے گھری ہوئی ہوتی ہے اُس کے قلب پر ایک تاریک پردہ ہر وقت آویزاں رہتا ہے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی' وہ کچھ کرنا چاہتی ہے مگر کر نہیں کر سکتی ہے لیکن جاہل عورت کو

یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ جس گھر میں سانس لے رہی ہے اُس کے اطراف میں کیا ہے اور وہ جس شہر میں زندگی بسر کر رہی ہے وہ دنیا کے کس حصہ پر آباد ہے ۔

خواتین !

کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ دنیا کی وسیع مردم شماری میں تمہاری تعداد مردوں سے نسبتاً کتنی زیادہ ہے ؟ پھر تم جس قوم کا عنصر ہو کیا تمہارے بیکار رہنے سے اُس قوم کے اعضا میں اختلال واقع نہ ہوگا ؟ ہماری زندگی کا مقصد عظیم یہ ہے کہ ہم عورت زادہ کہ مردوں کی طرح قوم و ملک کی خدمت کریں، اصلاح و تبلیغ کی ایک برقی رو ساری دنیا میں دوڑا دیں جس کا مخزن ہمارے گھروں میں ہو جسطرح بجلی کی روشنی تمام شہر میں دفعتاً پھیل جاتی ہے اور پھیلانے والا کسی کو نظر نہیں آتا ۔

ہم پردہ میں بیٹھ کر عصمت و عفت کے ساتھ قوم کی اعانت کر سکتے ہیں اپنے بچوں کو آیندہ نسلوں کے لئے تربیت دے سکتے ہیں اپنے شوہر یا والدین کے اشغالِ زندگی میں مشیر ہو سکتے ہیں، مگر یہ سب کچھ اُس وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے دماغ تعلیم سے منور اور علم سے مجلّی ہوں، اسلئے ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں محلوں میں شہروں میں اور اپنے حلقۂ اثر میں تعلیم نسواں کی اشاعت کریں ایسی تعلیم جو ہماری نوخیز لڑکیوں کو کامیاب خواتینِ سلف کا صحیح نقشِ قدم بنا سکے اور جس کے ذریعہ ہم اپنی قوم کے ناموس کو قائم رکھ سکیں ۔

میری طبیعت خراب ہے اور خطبۂ صدارت باقی، اس لئے میں اس وقت معافی چاہتی ہوں، اور اس شعر پر اپنی تقریر ختم کئے دیتی ہوں ۔

علم اگر احساس کی تکمیل کر سکتا نہیں
قوم کا بیڑا تباہی سے اُبھر سکتا نہیں

ہندوستان میں ثریا آج ایک منور ہستی ہے جس پر خورشید کو بجا طور پر ناز ہے وہ اکثر تنہائی میں اُس سے چھیڑتی رہتی ہے اور جب وہ کہتی ہے "مرزا صاحب ہمیں چھوڑ کر دوسری شادی کر لیجئے" تو خورشید جمال نہ رکنے والے تبسم کو ہونٹوں پر پھیلا کر سر جھکا لیتے ہیں ۔

ایڈیٹر

ہمارا دار المطالعہ

ہماری خلوت محفوظ میں جتنی کتابیں ہیں
نگاہ ہو نہیں وہ شوہر کی بہت اچھی کتابیں ہیں

لیا جائے اگر جائزہ بے سود نکلیں گی
نہیں جنکی ضرورت وہ یہاں موجود نکلینگی

کئی ناول کئی قصے کئی دلکش فسانے ہیں
ہر اک صفحہ پہ کچھ جذبات میں بھیگے ترانے ہیں

کئی جلدوں میں کچھ یورپ کی ہیں اسرار سربستہ
کئی اردو رسالے آتش آہ و شرر بستہ

کہیں ہے درس حسن و عشق میں تعلیم بے باکی
کہیں ہے ذکر قتل و جور میں تنظیم سفاکی

کہیں تشویق مشق تیر اندازی نگاہوں سے
کہیں تحقیق جذب قلب عاشق تیر آہوں سے

کسی البم میں عفت ریز عریاں چند تصویریں
کسی کالم میں ہیجان خیز گرم و تند تقریریں

شباب سالمعہ ہی صرف پیرس کی ہوس رانی
ہمارے دیکھنے کو فلسفہ بھی ہے نو یونانی

یہ ہے سرمایہ تفریح ہم پردہ نشینوں کا
پھر اس پر دل سنبھالا جا رہا ہے آبگینوں کا

شکایت ہے کہ ہم کیوں ہیں شریک احساس والوں میں
ہدایت ہے نہوں آزاد ہم اپنے خیالوں میں

پڑھی ہم نے نہیں اب تک حیات رابعہ بصری
نہ اب تک ہمنے دیکھی آنکھ سے حال النسائی

نہ سیرت ہے سامنے خاتون جنت کی
نہ ملت ہے نظر میں قافلہ سالار امت کی

نہ ہم نے خالدہ خانم کی تقریریں کبھی دیکھیں
نہ ہمنے ترکنوں کی خاص تحریریں کبھی دیکھیں

خواتین سلف کے کارنامے ہی نہیں دیکھے
کتاب عزم کے دو چار صفحے بھی نہیں دیکھے

صحابیات کے طرز عمل سے بیخبر ہیں ہم
نہیں معلوم دنیائے ترقی میں کدھر ہیں ہم

ادب جس قوم کا ہمکو سکھایا جائیگا گھر میں
اسی کی قومیت کا رنگ چڑھتا جائیگا گھر میں

کتابیں جو نئی باتیں بتائینگی وہ سیکھینگے
ہمیں ہم نشیں جو کچھ سکھائینگی وہ سیکھینگے

جو ہے پاس نسائیت تو میں کہتی ہوں مردانہ
کہ ہر گھر میں الگ ہو ایک نسوانی کتبخانہ

عابدہ خانم نسرین

تذکرۂ جمیل

(مسلسل)

مظہر

مظہر جہاں بیگم، بنتِ زین العابدین خاں، سنبھل (مراد آباد) کی رہنے والی ہیں، افغانی قوم سے ہیں اور سنبھل کے ایک معزز خاندان کی عزتِ حیات ہیں۔ اُردو اور قرآن کریم کی تعلیم اپنی والدۂ مرحومہ سے پائی ہے، فارسی منشی فاضل حافظ عبداللہ شاہ سے مکمل کی ہے۔ مضمون نگاری میں سید ممتاز علی مدیر تہذیب النسوان سے مشورہ لیا ہے۔ اور شاعری میں صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق کی شاگردہ ہیں ۲۰ سال کی عمر ہے۔ اور زندگی یکسر علمی و ادبی ذوق میں بسر ہوئی ہے والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور اپنے باپ کی نگرانی میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔

سب سے پہلے جب میں ٹونک گیا تو حضرتِ عاشق (مدظلہ) نے آپ کے چند شعر سنائے تھے اور آپ کی فطری شاعرانہ قابلیت کا تذکرہ کیا تھا، اسکے بعد پیمانہ میں آپ کی غزلیں شائع ہونے لگیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ دیکھنے والوں نے اس سے پہلے کہیں آپکا کلام دیکھا ہو، جہاں تک میرا خیال ہے پیمانہ ہی نے آپ کو ملک سے روشناس کیا، اور آج اس تذکرہ کے ضمن میں میرے یہ الفاظ حقیقت کی اہمیت سے غالباً ہم آغوش ہیں۔

کسی ہندوستانی شاعرہ خاتون کی شخصیت یا شاعری پر اس عہد میں تبصرہ کرنا اسلئے اور بھی مشکل ہے کہ ہندوستان ابھی نسوانی معیارِ ادب و شعر کا کوئی مفصل یا مجمل اندازہ نہیں کر سکا ہے، یہی نہیں بلکہ ابھی، طبقۂ نسوان میں بھی کوئی ایسی رُوح پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اُسے طبقۂ ذکور کے خصوصی افراد کی طرح اہمیت دیسکے۔ یہ ضرور ہے، کہ اس دنیا میں شعر و ادب، علم و کمال کی طرف سے ایک خاص بیداری مَیں محسوس کر رہا ہوں اور یہ اندازہ بھی ہو چلا ہے کہ اسکا کوئی خوشگوار نتیجہ بہت جلد رونما ہوگا، اس میں شک نہیں، کہ جب کسی قوم یا ملک کا معیار بدلتا ہے تو "عورت" ہی کا ذوق اس تبدیلی کا باعثِ خصوصی ہوتا ہے۔

یہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری خواتین جھجک جھجک کر بڑھ رہی ہیں، گو اسطرح کے بڑھنے میں بہت سی کمزوریاں اور گمراہیاں ہیں، تاہم یقین کرنا چاہئے۔ اطمینان سے یقین کرنا چاہئے، کہ جسطرح کنواں کھودتے وقت مٹی اور آب کثیف کی نمود کے بعد، ایک چشمۂ شیریں و صاف کے جلوۂ خنک سے ہماری نگاہیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح طبقۂ نسوان بھی اولیات منازل کی افراد و تفریط

گذر کر ایک فردوسی منظر کا عامل ہونیوالا ہے۔

مظہر کی شاعری پر میں انکے ماحول کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے کہنا چاہتا ہوں، مظہر نے اور انکے ذوق نے ایسی جگہ پرورش پائی ہے جہاں قدامت خیال بہت زیادہ فضا گیر ہے میں قدامت کو کبھی بُرا نہیں کہتا بلکہ میرا یہ ایمان ہے:۔ "کبھی متقدمین کو غیر مہذب اور بُرے الفاظ میں یاد نہ کرنا چاہئے کیونکہ ایک دن آئندہ نسلوں کے سامنے ہم بھی قدیم بننے والے ہیں"۔ لیکن اسکے ساتھ ہی میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس زمانے میں قدامت کی پیروی کہنی فضول ہے، کیونکہ انسان کی ہر ضرورت اُسکے حال سے وابستہ ہوتی ہے۔

مظہر کے اسلوب شعر نگاری میں ابھی (ماحول کی وجہ سے) وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے جسے لہجۂ نسائیت کہتے ہیں۔ مجھے تو نہایت تعجب ہوا جب اُنکی چند غزلوں میں میں نے بجائے ضمیر تانیث کے ضمیر تذکیر کا استعمال دیکھا۔ جیسے ؎

محویّتِ ذوق چاہتا ہوں بس اور کوئی مدعا نہیں ہے

تاہم یہ عوارض شروع میں ہوتے ہیں، اور مطالعہ و ذوقِ علم اس کمی کو پورا کر دیتا ہے، ہمیں چند کمزوریوں کی بنا پر کسی کی زندگی کے خوشگوار عنصر کو فراموش نہ کر دینا چاہئے، مظہر کے کلام میں کافی سامانِ کیفیت ہے اور کچھ شعاعیں ہیں جنکی تابانی میں ارتقا کے سورج جھلک رہے ہیں، اور پھر اُنکی درخشانی میں مظہر ہندوستان کی ایک کامیاب خاتون کی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

"مظہرستان" سے چند منتخب شعر لطافت سماعت بنائے جانے کے قابل ہیں فرماتی ہیں:۔

فردہ گل جیسے ہی پریشاں ہوتے جاتے ہیں چمن میں ہائے کیا حسرت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

مرے دل میں سی جاتی ہے اک مغموم دنیا سی کہ یاس و حسرت و ارماں کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

مفنادِ رخصت ہوئی گلشن میں اب غارتِ ماتم ہے گلوں میں رنگ کے اجزا پریشاں ہوتے جاتے ہیں

ان اشعار میں جو مظہر کی شعریت یا شاعری کا معیار ہے، حقیقتاً میں یہی انداز اور یہی رنگ شروعِ مشق میں مناسب خیال کرتا ہوں، لیکن فلسفۂ ارتقا کے مطابق اسے بہت زیادہ بلند اور جمیل ہونا چاہئے۔ امید ہی نہیں یقین ہے کہ تھوڑے ہی زمانے میں۔ مظہر بہترین شعر کہنے لگیں گی۔

ان اشعار میں بھی کافی اثر گیری موجود ہے، میں نے تو تیسرے شعر سے بیحد لطف لیا ہے، یقین ہے کہ آپ بھی مسرور ہونگے۔

دو شعر اور سنئے کیا خوب اور کس درجہ موثر ہیں۔

ویرانی خیال کا کیا ماجرا کہوں | ہوں دل میں ضبطِ یاس کا صحرا لئے ہوئے
برقِ نگاہِ ناز کی جلوہ نمائیاں | ہیں سوز و سازِ جذب کا ایما لئے ہوئے

میرے پاس زیادہ ذخیرۂ کلام نہیں ہے ورنہ آپکی سماعت کو کچھ اور دعوتِ تکلیف دیتا۔ صفحاتِ پیمانہ مستقبل میں اس کمی کو پورا کرینگے۔ بہرکیف مظہر صاحبہ کی خاندانی وجاہت ذاتی قابلیت اور فطری ذوق اس قابل ہے کہ میں انہیں انکی موجودہ کامیابی پر بہی کچھہ داد دوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد ایک خاص حیثیت کی مالک ہو جائینگی۔

ایڈیٹر

ملکۂ موسیقی

جب ساون کی اودی اودی گھٹائیں برس کر کہل گئیں ــــــ آسمان پر قوس قزح اپنی اور دلاویز رنگ آمیزی کیساتھ نمودار ہوئی ــــــ تو اس سنسان وادی میں جہاں میری جھونپڑی ہے ــــــ دلکش نغمہ کی لہریں ہر سو برق رفتاری سے دوڑنے لگیں ــــــ میں سمجھی کہ بارش کی دیوی شگفتگی کا فور وز منانے آئی ہے ــــــ اور معصوم فرشتے گیت گا رہے ہیں ــــــ میں نے اپنی جھونپڑی سے جھانک کر دیکھا ــــــ تو سنہری بانسری ہاتھ میں لئے سبز گہانس پر کہڑی مضراب نوازی کر رہی ہے ــــــ دریا کی لہروں میں اضطراب تہا ــــــ پرند مبہوت ہو کر درختوں سے نیچے گر رہے تہے ــــــ بہرکیف نغمے میری روح پر قابض ہو گئے، میرا جسم بے حس ہو گیا۔

تیرے سنہرے بال اور نرگسی آنکھوں پر نظر پڑتے ہی میں نے تجھے پہچان لیا ــــــ اف اف موسیقی کی ملکہ !!

ز۔ ب۔ ن ہمشیرہ محمد رشید دبیری۔

تیتری کا مدرسہ

تیتری آئی چمن میں رنگ پھیلاتی ہوئی
دامنِ موجِ ہوا کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی

اک غبارِ رنگ و بو کی طرح لہراتی ہوئی
ذرۂ برّاں کی صورت خوب تھراتی ہوئی

لغزشِ ذی روح وہ اک مختصر نقشِ رواں
قوتِ پرواز میں ذوقِ عمل کی بجلیاں

تیز رو اک ناز میں سیارۂ سطحِ فضا
وہ شگفتِ گل کی اک خاموش با معنی صدا

وہ شگوفوں کی چٹک سے شکلِ بو پھوٹی ہوئی
آئی اک جانب سے تاروں کی طرح ٹوٹی ہوئی

کنجِ گل کا دفعتاً آکر کیا اُس نے طواف
اور کیا اپنی نیاز آگینیوں کا اعتراف

پھول کی رنگیں کشش نے لے لیا آغوش میں
تیتری ہی مکتبِ خاموش میں

تیتری کے سامنے کھلنے لگے اوراقِ گل
ہر رگِ گل بن گئی آئینۂ اجزائے گل

نقطۂ تاریک تر روشن نظر آیا اُسے
پھول کی ہر نس میں اک گلشن نظر آیا اُسے

جمع ترکیبِ زرِ گل میں وہ نایاب تھے
جلوہ گر شبنم کے ہر قطرہ میں سو مہتاب تھے

درس اُسکو دے رہی تھی فطرتِ صبحِ بہار
منکشف اسرار اُس پر ہو رہے تھے بے شمار

اُسنے دیکھا ایک صحرا ہر انی میں خار کی
ذرّے ذرّے میں نظر آئیں صفیں کہسار کی

پھول کے پتے پہ اپنے سایہ میں نظر
اُسنے دیکھا اک جہانِ رنگ و بوئے مستتر

کچھ کھلے ہیں اور لاکھوں راز کے در بند ہیں
بند کلیوں میں ہزاروں میکدے سر بند ہیں

اُسنے سوچا اس طلسمِ رنگ کا دار و مدار
اُسنے دیکھا پردۂ گل میں کسی کو جلوہ بار

ایک بجلی سی نگاہوں چمک کر رہ گئی
تیتری کانپی ہلی جھجکی جھجک کر رہ گئی

کیف درسِ معرفت اسکی نظر میں چھا گیا
شدّتِ حیرت سے آخر وجد اُس کو آگیا

لے اڑی رنگیں فضاؤں میں ہوائے آرزو
رقص میں لے آئے جذباتِ مذاقِ جستجو

تیتری صحنِ چمن میں شام تک لرزاں رہی
مست کلیوں میں رہی پھولوں میں آویزاں رہی

رات بھر اُس پر رہی تاثیر درسِ صبح کی
اک جگہ قائم نہ بیتابی سے دلکی رہ سکی

پھر شعاعِ صبح سے پیدا ہوا الہامِ رقص
پھر وہی درسِ حقیقت پھر وہی پیغامِ رقص

ایڈیٹر

۸۷
دسمبر سنہ ۱۹۲۵ء
معلومات
خلاصۃ الباب
تحقیقاتِ جدیدہ
(۱) شہر اسکندریہ کے دو قدیم مینار
(۲) گرنیوچ کا ہیئت خانہ
(۳) قدیم مصریوں کا رسم الخط
(۴) مشاہدات
ایڈیٹر

تحقیقاتِ جدیدہ

شہر اسکندریہ کے دو قدیم مینار

اسکندریہ، تین سو بتیس سال قبل مسیح، سکندر ذوالقرنین کے حکم سے آباد ہوا تھا، بعض مورخین کا خیال ہے اس مقام پر اس سے پہلے کبھی کوئی شہر آباد نہیں ہوا۔ لیکن اب تحقیق ہوا ہے کہ اسی مقام پر ایک شہر "نون" پہلے آباد تھا اور اسکندریہ اسی شہر کی قدیم بنیادوں پر عہد سکندر میں آباد کیا گیا۔

اسکا معمار ایک مقدونیہ کا رہنے والا "ڈیلوکراٹیس تھا"۔ معلوم ہوا ہے کہ قدیم شہر کے اکثر محلے میں انہیں دیواروں کے احاطے میں بنائے گئے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ لیکن بعض محلے اس احاطے کے باہر بھی آباد تھے۔

اسکندریہ بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے۔ جسکے عقب میں ایک بڑی جھیل ہے۔ جو سمندر سے ایک کوس کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں دو قدیم بندرگاہیں جہازوں کی آمد و رفت کیلئے موجود ہیں۔ بندر کے ایک گوشہ میں ایک چھوٹی سی خلیج ہے جس پر ایک فانوسی مینار جسے پھاروس کہتے تھے بنوایا گیا تھا۔ اسکی بلندی چار سو فیٹ تھی۔ رات کی تاریکی میں اوسکی روشنی جہازوں کی رہنمائی کرتی تھی۔ خلیج پھاروس کو شہر سے ملحق کرنے کے لئے ایک پشتہ بنایا گیا تھا، جہاز ایک پل کے نیچے سے گذرتے تھے۔ دریائے نیل تک ایک نالہ کاٹ کر بنایا گیا تھا جو آب شیریں کی بہم رسانی کیلئے ایک مفید ذریعہ تھا، اسکندریہ میں ہر مکان کے حصہ زیرین میں ایک حوض بنایا جاتا تھا جسمیں صاف پانی کے ذخائر محفوظ رہتے تھے۔ اب بھی دو تین سات بڑے بڑے حوض موجود ہیں۔

سکندر کے بعد اسکندریہ دار الحکومت بنالیا گیا، مصر کے قدیم شہروں کو تاراج کرکے اسکی آراستگی میں صرف کر دیا گیا تھا۔ ایک زمانہ میں اسکندریہ روم کے برابر تھا۔ بلکہ تاجروں کی آمد و رفت اور اسباب تجارت کی بیع و فروخت سے اسکندریہ کی آبادی اور رونق روم سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔

ڈیوڈورس ایک قدیم مورخ کہتا ہے کہ عامۃ الناس کو چھوڑ کر تین لاکھ صرف روساء اس شہر میں آباد تھے۔ تیس برس قبل مسیح تک یہ شہر یونانیوں کے قبضے میں رہا۔ اسکے بعد رومی اسپر قابض ہوئے۔ پھر خلیفہ دوم جب مصر پر قبضہ کیا تو اسکندریہ مسلمان سلاطین کے سایہ حکومت میں آگیا۔

اسکندریہ میں دو قدیم مینار اب تک موجود ہیں، ایک ٹوٹ کر گر چکا ہے دوسرا ابتک ہنوز قائم ہے یہ مینار ایک نہایت سخت پتھر سے بنائے گئے ہیں۔ جسے گرانیٹ کہتے ہیں۔ یہ مینار صدیوں سے قائم رہا جن پر

ہوا اور پانی کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ مینار موجودہ کی بلندی ۹۰ فیٹ ہے۔ وہ مربع بنایا گیا ہے اور ہر پہلو پر بیس قسم قسم کی تصویریں تراشی گئی ہیں۔ یہ تصویریں قدیم مصریوں کے زمانے میں بجائے حروف و الفاظ استعمال ہوتی تھیں۔

قدیم مصری دو طرح کے حروف لکھتے تھے۔ ایک قسم کے حروف عوام کے لئے مخصوص تھے اور دوسری قسم کے خواص کے لئے مصری راہب جو نقوش بناتے تھے اُن سے بعض اشیاء کے نشانات کا اظہار مقصود ہوتا تھا چنانچہ جب وہ "خدا" لکھنا چاہتے تو ایک کلہاڑی کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ اور اگر "انسان" لکھنا مقصود ہوتا تو انسان کی تصویر بنا دیتے اسطرح اُن کے تمام حروف یا تو چھوٹی چھوٹی تصویریں ہوتے تھے۔ یا نشانیاں، جنہیں دیکھکر وہ معنی و مفہوم سمجھ لیتے تھے۔ اب وہ اشارات و نشانات رائج نہیں ہیں، اسلئے اُن نقوش کا راز سربستہ کماحقہٗ نہیں کھل سکتا۔ لیکن ایسے میناروں سے جن پر راہبوں کے نشانات بصورت تصاویر ثبت ہیں بہت سے نئے انکشافات ہوئے ہیں۔ چنانچہ مسٹر زوئیگا نے "نو سو اٹھاون نشانیاں علیحدہ علیحدہ تلاش کرکے اُن میں سے ایک سو چونتیس تصویروں کے معنی و مفاہیم پر روشنی ڈالی ہے۔
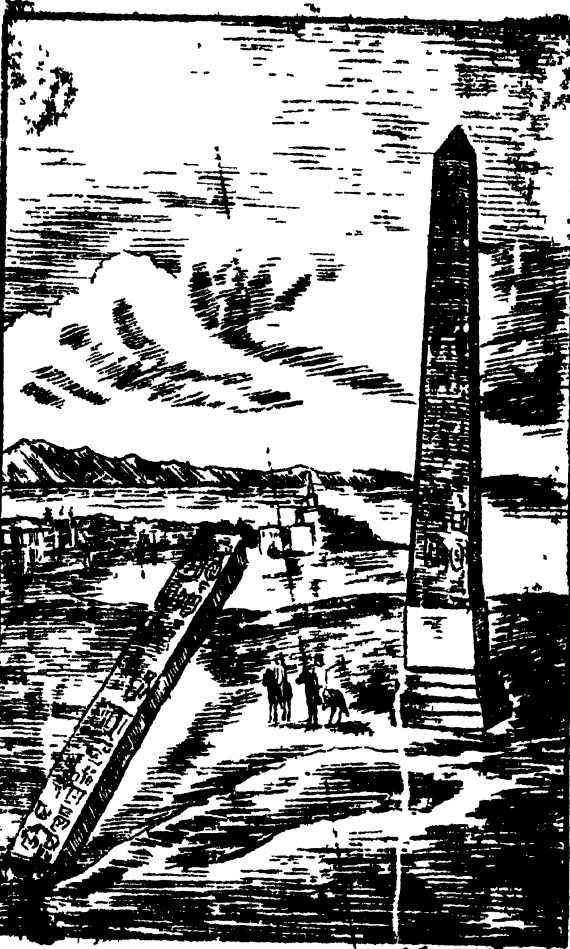
ان میناروں کے علاوہ، ایک اور ستون بلند بھی اسکندریہ میں موجود ہے یہ بھی سنگ گرانیٹ سے بنایا گیا ہے اور اسکا طول ۹۴ فیٹ ہے۔ یہ مینار پانپنی وائسرائے روم کے نام سے منسوب ہے۔ کرسی پر ایک کتبہ یونانی زبان میں ابتک موجود ہے۔ جسمیں لکھا ہوا ہے:۔

"یہ ستون ڈیوکلیشن قیصر کے نام پر نصب کیا گیا ہے۔"

لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ مینار بھی قدیم مصریوں نے بنایا ہے۔ اسلئے کہ اس قسم کے مینار اُن کے مندروں اور عالیشان مکانوں کے سامنے نصب کیے جاتے تھے۔

گرینوچ کا ہیئت خانہ

یہ مقام "گرینوچ" میں چھ سو بیگہ زمین کی وسعتوں، خوبصورت سبزہ زار، کشادہ میدان، اور لطیف فضاؤں میں بلندی پر واقع ہے۔ انگلستان کے جغرافیائی نقشوں میں ہر مقام کا شرقی یا مغربی بُعد اسی مقام کے نصف النہار سے ناپا جاتا ہے۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں جہازوں کی اسقدر کثرت ہوگئی تھی کہ سمندر میں جہازوں کے شرقی اور غربی بُعد کا دریافت کرنا دشوار ہوگیا تھا، بعض نے تجویز کیا کہ انگلستان سے جہازوں کے روانہ ہونے سے پہلے اگر تاروں کے درمیان چاند کی گردش کا پہلے سے تقرر کر لیا جائے تو اس ذریعہ سے جہاز کا عین مقام دریافت ہوسکیگا۔ اثنائے سفر میں جب امیر البحر چاند کو ثوابت اور سیاروں سے کسی سمت پر دیکھیگا تو اُسے فوراً معلوم ہوجائیگا کہ لندن میں اسوقت کیا بجا ہے۔ پھر جہاز کی گھڑی میں جتنا فرق پایا جائیگا اُسی کے مطابق فاصلہ صحیح دریافت ہوسکیگا۔

یہ تجویز ۱۶۷۴ء میں چارلس دوئم کے سامنے پیش کی گئی۔ بادشاہ نے چند عالمانِ ہیئت کو اس مسئلہ کی تحقیق کا حکم دیا۔ فلیم اسٹڈ ایک ماہرِ فنِ ہیئت نے بیان کیا کہ چاند کے مقامات کی جو فہرست موجود ہے وہ اسقدر ناقص اور غلط ہے کہ اُسکے مطابق تجویز عملدرآمد کرنا صحیح نتیجہ اخذ نہیں کرسکتا۔ ثوابت کا محلِ وقوع بھی ہنوز صحیح نہیں ہے اسلئے چاند اور تاروں کی حرکت کا صحیح معیار قائم کر لینا ناممکن ہے۔

اس تجویز کے مسترد ہونے پر چارلس دوئم کے حکم سے فلیم اسٹڈ نے گرینوچ میں ایک رصدگاہ کی بنیاد ڈالی فلیم اسٹڈ کا مشاہرہ ایک ہزار روپیہ سالانہ مقرر کیا گیا۔ فرمانِ شاہی اور ایک کتبہ سے جو اِسی مکان کے دروازہ پر موجود ہے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رصدگاہ کا مقصد تعمیر علمِ ہیئت اور فنِ جہازرانی میں ترقی دینا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے اکثر آلات فلیم اسٹڈ نے خود وضع کیے تھے۔ ۱۷۱۹ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔ فلیم اسٹڈ کا مرتب کردہ نظامِ ہیئت قدیم ہیئت دانوں سے صحیح تر تھا۔ چنانچہ دوربین میں حساب کے لئے بذریعۂ آلات مدارج قائم کئے تھے۔ اُسنے ایک گھڑی بنائی تھی جسکے ذریعہ وہ اجرامِ فلکی کی حرکت کا وہ وقت منضبط کر لیا کرتا تھا جب کہ وہ دوربین کے منظر سے گذرتے تھے۔

قدیم ہیئت دان مجبور تھے کہ تاروں کے متفرق مواقع دریافت کرنے کے لئے درمیانی فاصلہ کی پیمائش کریں فلیمسٹیڈ ہی اول اول اس قسم کی تدابیر پر مجبوراً عامل رہا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اُسنے گھڑی کے ذریعہ چھوٹے تاروں اور سیاروں کا فاصلہ معلوم کرلیا۔ اور یہ بھی معلوم کرلیا کہ برج حمل کا ابتدائی حصہ کہاں ہے جسمیں سورج کا خطِ محور آسمان کے خطِ استوا سے مل جاتا ہے۔ اس فاضل ہیئت نے تین سو دس تاروں کے مواقع کا اسدرجہ صحیح اندازہ کیا کہ علمائے متبعین نے انہیں بدستور مسلم رکھا۔

گرنیوچ کے بادشاہی ہیئت خانے میں خاص قسم کی کوششیں ہوتی تھیں۔ یہ غلط ہے کہ وہاں کے ہیئت دان صرف سیاروں یا کہکشاں پر نگاہِ تحقیق رکھتے تھے' یا سورج کے داغوں' اور چاند کے پہاڑوں کا نظارہ اُن کا مقصدِ خاص تھا۔ نہ تاروں کے فاصلے کی پیمائش اُن کا مطمحِ نظر تھی۔ اگرچہ اس قسم کے نظارے عموماً تفریح اور نشاطِ نظر کا باعث ہوتے ہیں لیکن ان میں نہ کسی حساب کی ضرورت ہوتی ہے نہ دماغی کاوشیں صرف کرنی پڑتی ہیں۔ بلکہ وہاں کے ہیئت دان اس فکر و غور میں لگے رہتے تھے کہ سورج' چاند' سیاروں' اور چند منتخب ستاروں پر جس جس وقت وہ دن میں یا رات میں نصف النہار کے سامنے سے گذریں' ایک ہی سمت میں نظر جمائے رہیں۔ اس حالت میں جنبشِ آلات و نظر کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور پھر حساب لگانے میں بہت زیادہ دقت ہوتی ہے۔ اس طرح متفرق اجرام کے مقاماتِ عجیبہ صحیح طور پر دریافت ہو جاتے ہیں۔

مگر اسکے علاوہ سر ولیم ہرشل اور سر جان ہرشل ممتاز ہیئت دانوں نے بڑی بڑی دوربینوں اور دوسرے آلات کے ذریعہ ہر طرف نگاہِ متجسس ڈالکر عجیب و غریب حالات دریافت کئے ہیں۔ مگر گرنیوچ میں صرف ایک خاص سمت کی ستارہ بینی ہوا کرتی تھی۔ اور اس انتظام میں بے حد حکمت اور عقل کی ضرورت ہوتی تھی ایک مرتبہ گرنیوچ کی رسدگاہ میں بیس فیٹ لمبی دوربین لگائی گئی تھی۔ لیکن تماشائیوں کا اسقدر ہجوم ہونے لگا کہ عام طور پر کاروبار اور اشتغالِ ضروری میں ہرج واقع ہونے لگا' آخر وہ دوربین اُتروا دی گئی۔

قدیم مصریوں کا رسم الخط

مصر کے قدیم مندروں کے ستونوں اور پٹیوں پر چند عجیب شکلیں بطورِ خط نظر آتی ہیں۔ یہ مصر کا قدیم خط ہے جسے مصری برہمن کام میں لاتے تھے۔ یہ خط دو قسم کے ہوتے تھے ایک وہ جسے عام لوگ لکھتے تھے اور ایک وہ جسے صرف مصری راہب استعمال کرتے تھے۔ اس قدیم رسم الخط میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جس چیز کا

آدمی کا نام لکھا جائے اوسکی تصویر کھینچ دی جائے۔ اہلِ چین ابتک لفظوں کی تصویریں کھینچنے کے عادی ہیں۔ قدیم مصریوں کے نقوش ایک ہزار قسم کے پائے جاتے ہیں۔ لیکن اکثر نقوش کے معنی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ صرف اسکا مفہوم مختلف گمانوں پر تعبیر کر دیا گیا ہے۔

سنہ ۱۷۹۹ء میں ایک سنگِ سیاہ دریائے نیل کے کنارے رشید میں پایا گیا تھا۔ اسمیں تین قسم کے خط تھے۔ پہلا خط شبیہ دار تھا' دوسرا خط لکیروں سے بنایا گیا تھا اور تیسرا خط قدیم یونانی خط تھا۔ یونانی خط کی مدد سے دونوں خطوں کا مفہوم سمجھ میں آگیا۔ اوسمیں یہ تحریر تھا کہ یہ الفنیلس نامی بطلمس پنجم کے عہد میں جو یونانی الاصل والیٔ مصر تھا۔ مسیح (علیہ السلام) سے ۱۹۳ سال پہلے کندہ ہوا" اس کتبہ میں اس بادشاہ کی تعریف یہی تھی کہ "وہ فدایانِ مذہب کی پرورش کرتا تھا' اور رعایا پر بقیۂ مالگذاری چھوڑ دیتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین پر غالب تھا۔ اور اُسنے ساحلِ نیل پر بہت سے بند باندھے تھے"۔ آخر میں لکھا تھا کہ "یہ کتبہ تین خطوں میں اسلئے لکھا گیا ہے تاکہ عام لوگ اسے سمجھ سکیں"۔ یہ پتھر تا ہنوز لندن کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔

مسٹر گلیڈن نے جو حکومات متحدہ کی طرف سے مصر میں بحیثیت سفیر کئی سال رہے تھے قدیم مصری خط کی بہت زیادہ تحقیق کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم اہلِ مصر جب کسی ملک یا کسی شخص کا نام لکھنا چاہتے تھے تو اسطرح لکھتے تھے جسطرح لفظ امریکہ پرانے خطوں میں لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ مثلاً (۱) باشنی سانپ کی صورت' یہ بادشاہت کا خاص نشان سمجھا جاتا تھا۔ (۲) دوسری صورت عصا کی ہے جو اختیاراتِ فوجی کا نشان تھا۔ (۳) تیسری صورت عقاب کی ہے۔ یہ بادشاہی کی علامت تھی۔ چوتھی صورت مینڈھے کی ہے۔ جسکے دو سینگ جودت و عقل کی علامت سمجھے جاتے تھے (۵) پانچویں صورت طفلِ نوپیدا کی ہے۔ (۶) چھٹی صورت دیوتا ؤں کی پیٹی کی ہے۔ (۷) صورت حیاتِ ابدی کی مصری علامت ہے۔ (۸) آٹھویں صورت سے ملک کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ یہ شکل چند الفاظ کے نیچے بنائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظِ بالا کسی ملک کا نام ہیں۔

جو الفاظ لکیروں سے بنائے جاتے تھے ۔ اُن کی تفصیل یہ ہے :۔

(۱) یہ شکل بطور الف لکھی جاتی تھی ۔

(۲) یہ گیدڑ کی صورت راہبوں کی علامت ہے ۔

(۳) یہ راج ہنس کی صورت "س" کی جگہ مستعمل تھی ۔

تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ مصر میں آلِ یعقوبؑ ایک عرصہ تک آباد رہی ۔ وہاں کے بادشاہ نے لوگوں کو اسیر کیا ۔ پتھر کے کتبوں میں یہودیوں کی تصویریں آجتک برآمد ہو رہی ہیں ۔ انکے ہاتھ پسِ پشت باندھ دئے گئے ہیں اور گویا یہ والیٔ مصر کی رکاب میں پیادہ پا جا رہے ہیں ۔
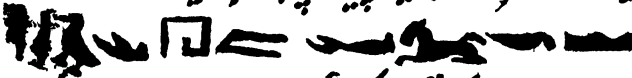
عرب میں وادی مکاتیب ایک عجیب مقام ہے ۔ وادی کے دونوں طرف سر بفلک پہاڑ کھڑے ہیں ۔ اور دورویہ چٹانوں پر پرانے مصری کندہ ہیں ۔ وادی ڈیڑھ کوس تک برابر چلی گئی ہے جسکے دونوں طرف تقریباً ایک لاکھ کتبے کندہ ہیں ۔ بعض کتبے اسقدر بلند کراروں پر لکھے گئے ہیں ۔ کہ سیڑھی بھی اُن تک نہیں پہنچ سکتی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا اوپر سے لٹکایا گیا ہوگا ۔ ان کتبوں کی تحقیق مدتوں سے ہو رہی ہے مگر صحیح پتہ نہیں لگا ۔

ڈاکٹر فاسٹر نے تحقیق کیا ہے کہ یہ مصری حروف ہیں ۔ جو اس زمانہ میں بنی اسرائیل ملک مصر آباد تھا ۔ ڈاکٹر فاسٹر نے بعض کتبوں کا ترجمہ بھی کیا ہے ۔ جو واقعات توریت میں ہیں وہ اکثر ان کتبوں میں پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً جنگ امالیکی جو رفیدم میں ہوئی ۔ (۲) حضرت موسیٰؑ کی تصویر ہاتھ اٹھائے ہوئے (۳) پھر حضرت موسیٰؑ کا ذکر "جہاں آبِ شور شیریں کیا گیا" پھر اُس چٹان کا ذکر جہاں حضرت موسیٰؑ نے عصا مارا تھا ۔ اور اُس سے پانی نکل آیا تھا ۔ پھر حضرت ہارونؑ کا ذکر کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کو اٹھا رہے تھے ۔

اسمیں شک نہیں کہ ساڑھے تین ہزار برس سے یہ مکاتیب حضرت موسیٰؑ کی چٹانوں پر لکھے ہوئے ہیں ۔

اور اپنی تاریخی صحت و اہمیت کی برابر گواہی دے رہے ہیں ۔

ایڈیٹر

مشاہدات

(دکن)

اورنگ آباد دکن میں انجنیئر نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو انسانی ہاتھ پر ایک رشتہ کے ذریعہ آویزاں کرنے سے حرارتِ عزیزی کے اثرات سے متاثر ہو کر قوتِ رجالی اور کیفیتِ نسائی کا مظاہرہ کر دیتا ہے۔ معمول میں اگر قوتِ رجالی کا اندازہ صحیح مقدار پر ہے تو آلہ آگے پیچھے نہایت زبردست حرکت کرتا ہے اور اگر کیفیتِ نسائی غالب ہوتی ہے تو ہتیلی پر تھر تھرا کر رہ جاتا ہے۔

اس آلہ کے واضع نے چند ایسے اجزاء سے مرکب کیا ہے کہ صرف کسی عورت کا نام لینے سے آلہ ہتیلی پر تھرتھرانے لگتا ہے اور کسی مرد کا نام لینے سے اسمیں وہی حرکت اضطراری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم انجنیئر صاحب موصوف کو اس ایجاد پر مبارکباد دیتے ہیں۔ جو بسا اوقات وجہ مسرت اور بعض حالتوں میں خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

حیدرآباد دکن میں نواب فخر الملک بہادر کی عظیم الشان حویلی میں جو بلندی پر واقع ہے اور جسکے سامان سے دکن کے قدیم جبروت وجلال کا پتہ چلتا ہے، ایک خاص کمرہ ہے۔ اسمیں یہ صنعت رکھی گئی ہے کہ تمام دروازے اور روشن دان بند کر دینے سے بھی ہوا پوری آزادی کے ساتھ کمرہ میں آتی رہتی ہے اور ہوا کا مدخل کہیں غور کرنے سے بھی نظر نہیں آتا۔

سرسالار جنگ بہادر کے ایوان خانہ میں چند مرمریں مجسّمے صنّاعی کا نادرالوجود نمونہ ہیں۔ ایک نسائی مجسّمہ کو حالتِ بعد غسل میں دکھایا گیا ہے۔ باریک سفید چادر سے جو غسل کے بعد سر سے پاؤں تک ڈال لی گئی ہے۔ پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور پانی کی نمی نظر آتی ہے۔ پھر نازک و لطیف چادر میں جو شکنیں اور خم پڑ گئے ہیں وہ صنّاع کے قلم کی ملکوتی قوت کے شاہد ہیں۔ پتھر میں محسوسات کے ایسے زندہ نقوش مرتسم کر دینا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

زعفران زار

(۱)

آپ جو ارشاد فرماتے ہیں کہ آسمانوں پر ایک ایسی جمیل وجسیم حور ہے کہ انسانی تخیل اُسے متصور نہیں کر سکتی' اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ تقریباً اُس کا قد اتنا طویل ہے کہ وہ اگر سطح ارض پر دراز ہو تو اسکا سر ہندوستان میں ہو اور ٹانگیں بغداد میں۔ تو مولانا ہم غریب ایسی حور کو لیکر کیا کرینگے کہ ہم غریب تو اس کا سر ہندوستان میں لئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ اور بغداد میں اُس سے کوئی .... رہے

(۲)

" ایران کا بادشاہ میں ہوں " ——— سبحان اللہ آپ کو کب معلوم ہوا ہے اور آپ کسوقت بر آئے ہیں۔ اچھا یہ تو بتائے کہ آپکی ذہن کے اسٹیشن (station) میں ایران کا رقبہ کیا ہے اور ایران میں مشہور مشہور شہر کون سے ہیں ——— ؟ " میں ایران کا بادشاہ ہوں " مجھ سے ایسا معمولی سوال ' ایران کا سب سے مشہور شہر " پیرس " ہے لندن ہے جہاں کی عورت سے حور مقابلہ نہیں کر سکتی جہاں کی شراب کے عکس سے کوثر خشک ہو گیا ہے۔ اچھا یہ جواب تو میرے بادشاہ ہونیکی کافی دلیل ہے ——— (بے شک) لیکن اب آپ آرام سے زندگی بسر کیجئے آپ کے دماغ کا بیلینس (Balance) قائم ہونیکی ضرورت ہے! شاہی خدمات کے لئے رضا خاں کافی ہیں۔

(۳)

آنیوالا ہے وہ زمانہ جلد آنیوالا ہے جب مسلم یونیورسٹی کا طالبعلم مسئلہ ارتقاو تجدید کی بنا پر شلوار پہنیگا اور اسپر ہیٹ (Hat) لگائیگا کیونکہ آج وہ زمانہ ہے کہ شیروانی پر ہیٹ لگانا جائز مان لیا گیا ہے۔

دونوں ٹانگیں آتی ہیں آج زمانہ ایسا ہے	لڑکے اے بی پڑھتے ہیں آج زمانہ ایسا ہے	روٹی کھانا آتا ہے آج زمانہ ایسا ہے
سب لنگڑے ہو جائینگے وہ ہی زمانہ آئیگا	لڑکے بی اے ہی ہونگے وہ ہی زمانہ آئیگا	روٹی کھانا بھولینگے وہ ہی زمانہ آئیگا

جس شاعر کا یہ معیار شعر ہو اُسکی ایک آنکھ فطرتاً بڑی ہونی چاہئے۔

(۴)

(ٹیگور سے کسی نے پوچھا " یہ آپ جہاں جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندوں کو ہندوستان آنے کی دعوت کیوں دیا کرتے ہیں؟" اس استفسار سے غالباً مستفسر کا کوئی عمیق مفہوم ہوگا۔ (لیکن اس کا

جواب میری فہم میں جو آسکا ہے وہ یہی ہے کہ "ہندوستان کی آب و ہوا احمقوں کے لئے موافق ہے"۔

(۵)

جب میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ "دنیا کے کامیاب انسانوں میں سب سے زیادہ بدصورت گاندھی ہے" تو مجھے خواہ مخواہ ہنسی آگئی اپنے دوست کے اس فقرہ پر نہیں بلکہ اپنے اس خیال پر کہ ہندوستان کے شاعروں میں ہمارا ایک موٹا شاعر بہت ہی قابل رحم ہے۔ اسکی معصومیت کا اندازہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ ۴۰ برس میں وہ شعر گوئی کی مشق کر رہا ہے۔

(۶)

دمشق پر جو مظالم ہوئے۔ اُن سے ہر مسلمان واقف ہے، اور ہر ہمدرد دل گریاں ہے، لیکن فرانس کی لڑکیوں سے اتنا تو دریافت کرہی لینا چاہیے کہ آخر اپنے اسیران محبت پر یہ جفائیں کیوں روا رکھی گئیں۔ جنرل سارائی کی موت پر دنیا کو افسوس ہوتا، لیکن اسکی زندگی نہایت وجہ مسرت ہے، کیونکہ اسکی تکلیف خلوت (جسے کتے کے خون پینے سے مشابہت دی جاسکتی ہے) ابھی بہت دن تک قائم رہیگی۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپکے خاندان کی خدمت مسلمان کرنیوالے ہیں!

(۷)

ایک مولوی صاحب بغرض تفریح ہوائی جہاز پر سوار ہوئے، جب جہاز معلق ہوا تو خوفزدہ ہونے لگے۔ اور عالم خوف میں انگریزوں کو گالیاں دینے لگے، ڈرائیور نے دیکھا اور مولانا کے چہرہ پر جو کیفیات تھیں اُس سے لطف اندوز ہوا کیونکہ مذاق سلیم کا حامل تھا، اسلئے اُسے کچھ تمسخر سوجھا، بظاہر حواس باختہ ہوکر اُسنے مولانا سے کہا، کہ خدا سے دعا کرو جہاز کی مشین بگڑ گئی ہے۔ اور عنقریب گرنیوالا ہے، مولوی صاحب رونے لگے، اور بجائے اسکے کہ خدا سے کچھ دعا کرتے، رو رو کر انگریزوں کو اور کوسنے لگے، اسی عالم میں اسٹیشن آگیا، اور جہاز عالم زیریں کیطرف فتادہ ہونے لگا، مولانا سمجھے کہ موت کا وقت قریب ہے اور جہاز بیکار ہوکر گر رہا ہے۔ موت سے بچنے کی بہترین ترکیب اُنکے دماغ عالی میں یہی آئی کہ جہاز سے کود پڑیں نہایت تیزی سے زمین کیطرف جست کی لیکن اُنکے غصہ کی مایوسی حیرت اور بیوقوفی کی حد نہ رہی جب انہیں ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ معلوم ہوا کہ وہ اپنی جگہ چمڑے کے تسموں سے بندھے ہوئے ہیں۔ واقعی الیکڑ ڈاڑھی والے بیوقوف قابل رحم ہوتے ہیں۔

"س"

مصورِ جذبات مولانا شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی

پیمانہ دسمبر ۱۹۲۵ء

الہامات

ھ

خلاصۃ الباب :-

(کلام المشاہیر تازہ و غیر مطبوعہ)

حضرت جوش ملیح آبادی

"ہوس" انجام کی تلخی سے ڈر جاتی تو اچھا تھا — ہمارے دل سے یہ دنیا اتر جاتی تو اچھا تھا

یہ مانا حسن میں پائی نشاطِ زندگی میں نے! — ذرا کچھ اور بھی گہری نظر جاتی تو اچھا تھا

کل شبِ غم گلاب کی "خوشبو" — میری آنکھوں میں بن گئی "آنسو"

یہی وہ وقت ہے جب شاعروں کے دل دھڑکتے ہیں — اندھیری رات ہے، میدان ہے، تارے چمکتے ہیں

ان ہی سے بہت عالم آباد ہو گئے ہیں — جو جو تری نظر سے برباد ہو گئے ہیں

ابھی دیکھا ہی کیا آئینہ؟ سامان ہیں تلاطم کے — تری آنکھوں میں تازہ نقش ہیں تیرِ تبسم کے

یہ مدعیِ عقل نہیں جانتے ہیں کچھ — کیا ہے ہمارا حال ہمیں جانتے ہیں کچھ

ابتدا ہی ابھی کہانی کی — ہائے کیا نیند ہے جوانی کی

دل میں باقی تھا جو اک ذوقِ طلب وہ بھی نہیں — اک مزہ کاوش میں ہتا تھا سو وہ بھی نہیں

حواسوں کو جگاتی ہے نگاہیں کھول دیتی ہے — محبت سینکڑوں انساں پہ راہیں کھول دیتی ہے

ماسوا کے کبھی خارج میں نہ قائل ہونا　　ماسوا ہے فقط اللہ سے غافل ہونا

کیوں بحث کریں کون ہے کیا چیز ہے کیا ہے　　ہم تو فقط اتنا ہی سمجھتے ہیں "خدا ہے"

مولانا نظم طباطبائی لکھنوی

ہمیشہ ہمت عالی کو اپنا راہبر جانا　　اوسی رستے چلا جس راستے کو پرخطر جانا
شعاع و رنگ کو سرگرمیٔ ساز ہستی کی　　تماشائے جہاں کو نغمۂ تار نظر جانا
مصائب بھی جہاں کے بے ثبات ایسے نظر آئے　　کہ میں نے آفتاب حشر کو شمع سحر جانا
گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں اے خوف رسوائی　　شکست رنگ کے نغموں کو بھی کیا شور و شر جانا
کسی ہو کے میں جان اپنی دے دیتے ہیں پروانے　　انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاج زر جانا
مجھے وارفتگی پر نشۂ عرفاں کا دہوکا تھا　　جسے کچھ بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا
روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستارہ کی　　تبسم برق کا اسکو اسے رقص شرر جانا
خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا　　جو پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

رہا ادراک تو عاجز ہی لیکن اوس کی ہستی کو
باندازِ دگر سمجھے باندازِ دگر جانا

حضرت امیر بدایونی

دیکھکر جلوہ طلب دیدہ حیراں ہونا　　محشر راز ہے آئینہ کا عریاں ہونا
خلوتِ آئینہ ہے کثرتِ صد بزم نگاہ　　یعنی اک شمع سے ممکن ہے چراغاں ہونا
مژدہ اے خجلتِ نومیدی ارباب نظر　　نگہ ناز کو منظور ہے عریاں ہونا
خوئے دشوار طلب ہے کہ ہے آساں دشوار　　ورنہ دشوار ہے دشوار کا آساں ہونا
کہہ رہی ہے روشِ ہستی ارباب وجود　　شوخی مہر ہے ذرہ کا بیاباں ہونا

وہم بیباکیٔ طوفانِ ہوس ہے ورنہ — شعلہ چاہیے نہ چراغ نہ داماں ہونا
ہو گیا باعثِ صد حشر تماشے وفا — اک نزا وعدۂ فردا سے پشیماں ہونا
صحبت چشم ہے بیعانۂ صد عشوہ بہ ناز — ورنہ ہر مو کو میسر نہیں مژگاں ہونا

مستحق ہم بھی ہیں آمرزشِ فردا کے امیر
ہے اگر خوئے کرم عادت نسیاں ہونا

حضرتِ وحشت (کلکتہ)

کچھ مسرت ہے وفا پر اُن کو مائل دیکھکر — کچھ ہے مایوسی ہجوم حسرت دل دیکھکر
شوق بسمل کا اِدھر غلبہ اُدھر طغیانِ ناز — رہ گیا میں جنبش بازوئے قاتل دیکھکر
کون سمجھے مدعا کیا ہے نگاہِ ناز کا — کچھ کیا ارشاد اُس نے جانبِ دل دیکھکر
تھا جگر کو بھی جگر داری کا دعویٰ عشق میں — خون ہوکر بہگیا بربادیٔ دل دیکھکر
صاحب محمل کے دل میں کچھ کدورت رہ گئی — خاک مجنوں کو بلا گرد ان محمل دیکھکر
دیدۂ مشتاق کی حرماں نصیبی کیا کہوں — پھر نہ کچھ دیکھا گیا اُن کو مقابل دیکھکر
کام اپنے منحصر اُن کی مروت پر گئے — میں نے عرض مدعا ئے دل کو مشکل دیکھکر
بیخبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق — جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسم منزل دیکھکر
رفتہ رفتہ دل نے اپنا شیوہ بیتابی کیا — عشق میں آئین خودداری کو مشکل دیکھکر
قعر دریا تھا محرک ہمت مردانہ کا — میں نہ بھولا دلفریبی ہائے ساحل دیکھکر
آئے تھے افسردہ دل ہم اک ہیں اک برق تپاں — محفل افروزی تری اے شمع محفل دیکھکر
وقت آخر چشم عبرت نے بہا اشک یاس — عمر بھر کی کاوش و کوشش کا حاصل دیکھکر

حضرت اکبر حیدری

شمع میں اک سوز تھا۔ اک ساز پروانے میں تھا — کس کا عنوانِ محبت۔ کس کے افسانے میں تھا
کیا کہوں۔ کیوں رنگ اتنا میرے افسانے میں تھا — ایک قطرہ خون تھا جو دل کے پیمانے میں تھا

پوچھ اُس کی آنکھ سے اپنی نظر کی مستیاں
ایک میخانے کا حاصل جس کے پیمانے میں تھا

شمع کا شعلہ بڑھا آغوشِ جاذب کی طرح
پھر جو دیکھا غور سے کچھ بھی نہ پروانے میں تھا

سجدہ گاہِ عشق میں میری عبودیت تو دیکھ
ڈھونڈ کر لایا ہوں وہ دل جو صنم خانے میں تھا

طالب و مطلوب دونوں تھے نرالے رنگ میں
ایک قطرہ آنکھ میں تھا ایک پیمانے میں تھا

کس مپرسی حسن کی اور قدر و قیمت عشق کی
پوچھ اُس گل سے جو تنہا ایک ویرانے میں تھا

اہل دل نے آہ کی اور میں نے آنسو پی لئے
کچھ نہیں تھا پھر بھی سب کچھ میرے افسانے میں تھا

کہنے والے نے تو جو کچھ دل میں آیا کہہ دیا
دیکھنے والے سے پوچھو کون بُت خانے میں تھا

عہدِ طفلی ۔ عہدِ پیری ۔ یاد ہیں دونوں مگر
نامکمل باب بھی اک میرے افسانے میں تھا

آگہی نے منہ چھپایا ۔ بیخودی ہنسنے لگی
جامِ جم کم ظرف سا اک ظرفِ میخانے میں تھا

وہ لبِ منصور پر رازِ انا الحق بن گیا
جو بہت کمزور فقرہ میرے افسانے میں تھا

یاس نے بھی دور سے دیکھی جھلک اُمید کی
آرزو کا آشیانہ دل کے ویرانے میں تھا

آپ کی آنکھوں میں کیوں آنسو تڑپ کر رہ گئے
کیا کوئی ٹکڑا اثر کا میرے افسانے میں تھا

کانپ کانپ اُٹھا ہوں اکثر دیکھ کر دیوار و در
ارتعاشِ کس مپرسی میرے غم خانے میں تھا

حضرت آزاد انصاری

میں اور تری شکایت ؟ تہمت ہے ۔ افترا ہے
جو دل میں ہے زباں پر ۔ اللہ جانتا ہے

تو اور چشم پوشی ۔ قسمت کی خوبیاں ہیں
ہم اور کس مپرسی ۔ تقدیر کی خطا ہے

اِن بے نیازیوں کا انجام کچھ نہ ہوگا
اِن ناشکیبیوں پر کیا جراٴت آزما ہے

حسرت نصیب آنکھیں تیری ہی منتظر ہیں
کلفت نصیبوں کا اک تو ہی مدعا ہے

اب ہم تمہیں بتائیں ۔ دامِ کرم بچھا دو
اغماضِ دلشکن کا موقع گزر چکا ہے

ہم آپ کی بدولت کلفت نصیب ٹھہرے
اک جانِ مبتلا ہے ۔ اور مجمعِ بلا ہے

اب کوششِ تغافل کچھ فائدہ نہ دیگی
مایوس ہو چکا ہوں اور صبر آچلا ہے

ظالم ! وہ دشمن کہ تیری حسرت سے نامراد ہے
اک خار ہے کہ میرے دل میں کھٹک رہا ہے

کافر! وہ غم کہ تیری الفت کا ماحصل ہے | اک زخم ہے کہ جسکی ہر ٹیس جانگزا ہے
وہ دوستوں کے جلسے۔ وہ دل لگی کے ساماں | گزرا ہوا زمانہ آنکھوں میں پھر رہا ہے
دریا ہے اور تلاطم۔ کشتی ہے اور تباہی | اے ناخدائے عالم! اب تو ہی ناخدا ہے

آزاد! تا بہ امکاں منزل کی جستجو کر
اللہ راہبر ہے۔ اللہ رہنما ہے

علامہ سیماب اکبرآبادی

مثلِ شبنم رائگانِ عالمِ برباد ہوں | میں چمن کے پتے پتے کو ابھی تک یاد ہوں
اب شعاعِ مہر کو مشکل ہے میرا ڈھونڈنا | گوشۂ تاریک میں اک ذرۂ برباد ہوں
بُو بہر موجود ہے انفاسِ فانی پر مرے | ہوں بنائے قصرِ ہستی اور بے بنیاد ہوں
بسکہ ہوں آوارۂ دورِ بسیطِ کائنات | کیا کسی کمبخت کی بھٹکی ہوئی فریاد ہوں
تکملہ ہے داستاں میری حدیثِ باغ کا | یاسمین و یاسمن کی آخری روداد ہوں
ہے مری تخلیق تعمیلِ تمنا ہائے "کُن" | میری فطرت ہے تمنا میں تمنازاد ہوں
اشک کہتے ہیں کہ ہم ہیں نغمۂ سیلابِ یاس | درد کہتا ہے کہ مضرابِ لبِ فریاد ہوں
ابتدا ہے میری عریاں۔ خاک ہے میری سرشت | خلقتاً میں بے نوا ہوں فطرتاً برباد ہوں
اے جہانِ عشق میں خوش رہنے والو! الغیاث | انتہائے بیکسی یہ ہے کہ میں ناشاد ہوں
آسماں نے صورتِ یک قطرہ پھینکا تھا مگر | رنگ و بُو کی گود میں آسودۂ افتاد ہوں
سانس لے کر تڑپاتا ہوں قیودِ روح کو | میں اسیرِ جسم کی بھولی ہوئی میعاد ہوں
حادثات و نقص سے محدود ہے دنیا مری | وسعتِ عالم سمجھتی ہے کہ میں آزاد ہوں
ظلم اک رخ ہے مری اغلاط کی تصویر کا | پھر نہیں معلوم کس سے شاکیٔ بیداد ہوں؟

صرف ہوں گی حشر تک جبیں مری تکمیل میں
میں تو نقشِ ناتمامِ عالمِ ایجاد ہوں

مولانا عزیز لکھنوی

الحذر یہ دل اوسیکا فرش پا انداز ہے
بجلیوں کی رَو میں جو مستِ خرام ناز ہے

سازِ نیرنگ جہاں بھی دیکھئے کیا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

تنگیٔ دل سے صدا نکلے تو کچھہ تاثیر ہو
ورنہ یوں تو ہر کلی کے منہ میں بھی آواز ہے

آگئی وہ فصل گل وہ لے اڑا جوشِ جنوں
جنبشِ موجِ ہوا مجکو پر پرواز ہے

انتظارِ موت میں دن کاٹتا ہوں زیست کے
زندگی اب میرے مقصد میں خلل انداز ہے

نازِ ساقی کون اٹھاتا ہے خمارِ شوق میں
ایک ہی انگڑائی میں میکدہ کا باز ہے

عقدہ کو لاحل بناتی جاتی ہے فطرت اِدھر
ناخنِ تدبیر کو فکر کشود راز ہے

ہر شکن بستر کی بجلی بنکے دل تک آگئی
سونیوالے یہ بھی سونیکا نیا انداز ہے

حسن کی خودداریاں کبتک حجابِ ناز میں
میں صدا دیتا ہوں تمکو یہ میری آواز ہے

دل میں جو کچھہ تھا وہ آخر لے اڑی موجِ نسیم
جامۂ ہستی کے باہر اب گلوں کا راز ہے

انتہا دل کی رسائی کی کسے معلوم ہو
یہ بھی کیا روح القدس کی طاقتِ پرواز ہے

نزع میں ہلتے ہیں میرے ہونٹ سنئے غور سے
یہ میری آواز ہے یا آپ کی آواز ہے

نغمۂ غم کے سوا اس ساز میں کیا ہے عزیز
عالم اک ٹوٹے ہوئے دل کی شکستہ آواز ہے

تصانیف علامہ مولینا سیماب اکبرآبادی

سیرۃ الکبریٰ ؓ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت صلعم کی سب سے پہلی بیوی تھیں آپ کے مبسوط و مستند حالات مع نقشہ مزار شریف اس سیرۃ میں درج ہیں حجم قریباً سوا سو صفحات قیمت علاوہ محصول عہ

بنت الرسول ؑ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر حضرتِ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالاتِ زندگی سلیس اردو زبان میں قیمت علاوہ محصول ۸ر

سیرۃ الحسین سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی پیدائش سے شہادت تک اسمیں درج ہیں آپ کے مزار مقدس کا فوٹو اور شہدائے کربلا کے مزارات کا فوٹو اور تقریباً دیرہ درجن کے قریب اسمیں لگے ہوئے ہیں دو رنگوں سے چھپا ہوا سرورق کربلا کا بیان اور مولینا کی زبان دیکھنے پڑھنے اور گھروں میں رکھنے کے قابل ہے قیمت علاوہ محصول عہ

سوانح خواجہ غریب نوازؒ خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مکمل و مفصل معتبر و مستند حالاتِ زندگی مع متعدد نقشہ جات درگاہ شریف جو فوٹو لیکر شریک کتاب کئے گئے ہیں قیمت علاوہ محصول عہ

حالاتِ حالی شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کی مفصل باتصویر سوانح عمری قیمت علاوہ محصول ۶ر

چراغِ داغ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم کے مکمل حالاتِ زندگی باتصویر قیمت ۶ر علاوہ محصول

سوانح زیب النسا بیگم شہزادی زیب النسا بیگم کے محققانہ حالات زندگی مع تصویر قیمت ۸ر علاوہ محصول

ملنے کا پتہ :- مینجر پیمانہ بک ایجنسی آگرہ